ماہنامہ
دسمبر 2024ء
طلوعِ اسلام
لاہور
اشاعت کا اسی واں سال

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ
کی خواہش پر 1938ء سے شائع
ہونے والا ماہنامہ

تحریکِ طلوعِ اسلام
کنونشن 2024ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فرمودات قائداعظمؒ

قرآن کریم

☆''میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا' نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے' البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے' اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں' زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی' سیاسی ہو یا معاشی غرض یہ کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطے سے باہر ہو''۔ (عثمانیہ یونیورسٹی' حیدرآباد دکن' 1941ء) (طلوع اسلام' جنوری 1948ء صفحہ:55)

☆☆☆☆☆☆☆

☆''بعض لوگ نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسلام کیا ہے؟ یہ لوگ یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ میں اسلام سے ناواقف ہوں' میں نے قرآن کریم کو بار بار بغور پڑھا ہے اور جب میں نے یہ کہا تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہوگا تو یہ محض ادعا اور بڑ نہیں تھی''۔ (طلوع اسلام' فروری 1959ء' صفحہ:70)

☆☆☆☆☆☆☆

☆''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں' اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی' نہ کسی اور شخص یا ادارے کی' قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کر سکتے ہیں اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے''۔

(عثمانیہ یونیورسٹی' حیدرآباد دکن' 1941ء) (طلوع اسلام' جنوری 1966ء' صفحہ:14)

☆☆☆☆☆☆☆

☆''آپ نے مجھ سے ایک پیغام کی خواہش کی ہے۔ میں بھلا آپ کو کیا پیغام دے سکتا ہوں' روشنی اور راہنمائی کے لئے تو ہم سب قرآن کے عظیم ترین پیغام سے فیضیاب ہیں''۔

(فرنٹیئر مسلم اسٹوڈنٹس کانفرنس' 4 اپریل 1943ء) (طلوع اسلام' جنوری 1966ء' صفحہ:47)

☆☆☆☆☆☆☆

بقیہ صفحہ نمبر 58 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
دسمبر 2024ء

جلد 77 شمارہ نمبر 12

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: رُوداد کنونشن 2024ء	ادارہ	4
پرویزؒ صاحب کا پیغام اراکین بزمہائے طلوعِ اسلام کے نام	ماخوذ از منزل بہ منزل	5
موجودہ مسائل اور قرآنی حل	خورشید انور (چیئرمین ادارہ)	9
مستقل اقدار اور اُن کی اہمیت	ڈاکٹر اعجاز رسول (وائس چیئرمین ادارہ)	16
تصویری رپورٹ	ادارہ	26 تا 33
تعمیرِ بیابانِ دگر	محمد عامر (نمائندہ بزم کراچی)	39
مسلمانوں کے موجودہ مسائل اور اُن کا قرآنی حل	ارشد علی ایڈووکیٹ (نمائندہ بزم سوات)	49
چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام کا خطاب (ہفتہ 26 اکتوبر 2024ء)	خورشید انور (چیئرمین ادارہ)	52
وَالْعَصْرِ	خالد بشیر فاروقی، لاہور	56

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیاء کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

رُوداد کنونشن 2024ء

ادارہ طلوع اسلام کا دوروزہ سالانہ کنونشن 26 اور 27 اکتوبر 2024 (ہفتہ اور اتوار) کو گلبرگ لاہور میں منعقد ہوا۔ ملک بھر اور بیرون ملک سے آئے ہوئے وفود نے کنونشن میں شرکت کی۔ دوسرے اور اختتامی روز مقررین نے "موجود مسائل اور قرآنی حل" کے موضوع پر اپنے مقالات پیش کئے۔ جن میں مقررین نے تمام مسائل کا حل قرآن کے احکام پر عملدرآمد کو قرار دیا۔ مقررین نے کہا کہ بانیان پاکستان کا برصغیر میں ایک علیحدہ مملکت کے مطالبے کے پیچھے واحد مقصد یہ تھا کہ ایک ایسی آزاد مملکت وجود میں آجائے جس میں قرآن کریم کے ابدی اصولوں کے مطابق ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس کو تمام انسانیت کی فلاح کیلئے بطور نمونہ پیش کیا جائے۔ مقررین نے کہا کہ طلوع اسلام کی بنیاد علامہ اقبال کی رائے پر رکھی گئی تھی اور اسکا مقصد اس وقت تحریک پاکستان کے دینی پہلو کو اجاگر کرنا تھا اور قیام پاکستان کے بعد اس کا مقصد بانیان پاکستان کے تصور کے مطابق پاکستان میں قرآن خالص پر مبنی نظام اور معاشرے کا قیام ہے۔ کنونشن کے اختتام پر چیئرمین ادارہ طلوع اسلام جناب خورشید انور نے تمام شرکاء کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ علامہ غلام احمد پرویز نے قرآن کی ترویج و اشاعت کیلئے اپنی زندگی وقف کی تھی اور ادارہ طلوع اسلام اسی مشن کو لیکر آگے بڑھ رہا ہے۔

ہفتہ کے روز ادارہ کی جنرل کونسل کے اجلاس ہوئے۔ شام کو بزم ہائے طلوعِ اسلام کے نمائندگان وارا کین کے درمیان رابطۂ باہمی اور مجلسِ استفسارات کے سیشن چلتے رہے۔ جبکہ اتوار کے روز سیمینار میں پاکستان کو درپیش مسائل کا حل قرآنِ کریم کی رہنمائی کی روشنی میں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ مجموعی طور پر مقررین نے قرآن کے تجویز کردہ نظامِ ربوبیت کے قیام پر زور دیا تاکہ انسانیت کا سفینہ مشکلات ومصائب کے بھنور سے نکالا جاسکے۔ نوعِ انسانی آج اپنے مسائل کے حل کے لئے ایسے ہی نظام کی طرف منتظرانہ نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ طلوعِ اسلام ایک تحریک کے طور پر علامہ پرویز علیہ الرحمۃ کی تحریرات کی روشنی میں، قرآنِ کریم کو عقل اور فکر سے سمجھ کر دنیا کو متعارف کرانے کا عزم رکھتی ہے۔ قرآنِ خالص کو اپنا آئین بنائے بغیر دنیا وآخرت کی بھلائی ممکن نہیں ہے۔ قرآنی اقدار ہی انسانی ذات کے ارتقاء کا ماحول فراہم کرسکتی ہیں جس کے نتیجے میں پاکستان اور بتدریج پورا کرۂ ارض جنت کی مثال بن جائے گا۔ تفصیل کے لئے آئندہ صفحات میں کنونشن کی تقاریر اور تصاویر آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ماخوذ از منزل بمنزل

پرویز صاحب کا پیغام

اراکین بزم ہائے طلوعِ اسلام کے نام

طلوعِ اسلام کی انیسویں سالانہ کنونشن 21 تا 24 اکتوبر 1976ء گلبرگ لاہور میں منعقد ہوئی اس موقع پر محترم پرویز صاحب کے استقبالیہ خطاب کا موضوع تھا ''آدمِ نو کی تخلیق'' 1976ء کے بعد ملک کے حالات نامساعد رہے اس لئے طلوعِ اسلام کے سالانہ کنونشن منعقد نہ ہو سکے۔ یوں سمجھئے کہ اراکینِ بزم ہائے طلوعِ اسلام سے محترم پرویز صاحب کا یہ آخری خطاب تھا اس لئے خصوصی طور پر ہم سب کے لئے توجہ کا مستحق ہے۔ تحریکِ طلوعِ اسلام کا مقصد بیان فرماتے ہوئے محترم پرویز علیہ الرحمۃ صاحب نے کہا:

تحریکِ طلوعِ اسلام کا مقصد' عزیزانِ من! اسی قسم کے منتشر افراد کو ایک مرکز پر جمع کرنا ہے۔ وہ افراد جنہیں یہ یقینِ محکم حاصل ہو کہ انسانی مشکلات کا حل' قرآنِ مجید کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔ اب میرا روئے سخن بالخصوص ان احباب کی طرف ہے جو اس مقصد کو دل میں لئے اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہو چکے ہیں' اور اس غرض کے لئے اس اجتماع میں شریک ہوتے ہیں کہ اس تحریک کے فروغ اور اس مقصد کے حصول کے لئے کیا کچھ مزید کیا جائے۔ یہ جذبہ بڑا مبارک اور اس قسم کی کوشش بڑی مستحسن ہیں۔ لیکن میں اس سلسلہ میں ایک وارننگ نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ قرآنِ کریم محض فکری وحدت کو کافی قرار دے نہیں سکتا۔ اس کے نزدیک حقیقی وحدت وہ ہے جو قلوب کی ہم آہنگی سے پیدا ہو۔ جو شخص فطری طور پر اس مقصد کو صحیح سمجھ کر اپنے آپ کو اس رشتہ میں منسلک کرے گا وہ اس روپ میں شامل ہو جائے گا۔ لیکن صرف اتنے سے وہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکے گی جسے قرآن فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ (3:103)۔ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی دلوں کا آپس میں جُڑ جانا اور ایسا ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ کی فکر' آپ کے احساسات وجذبات کو متاثر اور متحرک نہ کرے۔ یاد رکھئے! تنہا فکر' عمل کی محرک نہیں ہو سکتی۔ عمل کے محرک' جذبات واحساسات ہوتے ہیں۔ جب مختلف افراد کے جذبات' ایک جیسی فکر سے متاثر ہوں گے تو ان کے اندر وحدتِ کردار وعمل پیدا ہو گی۔ اسی لئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ۔۔۔ وحدت افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام۔۔۔ اس قرآنی حقیقت کی اہمیت کو اب مغربی مفکرین بھی سمجھنے لگے ہیں' حالانکہ اس سے پہلے ان کا سارا زور فکری ہم آہنگی پر ہوتا تھا۔ عصرِ حاضر کے مشہور مؤرخِ تہذیب (J.H.Denison) نے ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے۔۔۔

(Emotion as the Basis of Civillization)۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ علامہ اقبال جیسے عظیم مفکر نے اپنے چھٹے خطبہ کے شروع میں اس کتاب کا ایک طویل اقتباس دیا ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں (George Foot Moore) لکھتا ہے۔

''تہذیب کا نشوونما اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کسی مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرے۔ اس قسم کا اتحاد' تنہا وحدتِ فکر کی بنا پر ممکن نہیں ہوتا یہ اتحاد وحدتِ جذبات واحساسات سے ممکن ہوتا ہے جن سے انسانی فکر میں جذباتی تحرک پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ معتقدات اور مقاصد بن جاتے ہیں۔''

میں نے محسوس کیا ہے کہ ہم میں (یعنی جنہوں نے اس تحریک سے وابستگی اختیار کی ہے ان میں قدر مشترک یا وجۂ پیوستگی' فکری وحدت ہے' اور ہماری غلط نگہی یہ کہ ہم نے اس کو کافی سمجھ لیا ہے۔ ہم میں جذبات واحساسات کی وحدت پیدا نہیں ہوئی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم میں بھی (دوسرے لوگوں کی طرح) اکثر باہمی نزاعات ابھرتی رہتی ہیں' حالانکہ جذباتی وحدت میں کسی قسم کی نزاع کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ یہ جو قرآنِ کریم نے مومنین کی یہ خصوصیت بیان کی ہے کہ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ (9:71)۔ وہ ایک دوسرے کے جگری دوست ہوتے ہیں' تو اس قسم کے تعلقات جذباتی وحدت کے بغیر ممکن نہیں۔ محض فکری وحدت سے آپ میں' گھڑی کے پرزوں کی طرح' میکانکی تعاون تو پیدا ہوجائے گا۔ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ (9:71) کی کیفیت پیدا نہ ہوگی۔ گھڑی کے پرزے ساری عمر محوِ گردش رہتے ہیں لیکن رہتے ہیں ویسے کے ویسے ہی' بلکہ وہ گھِس کر ناکارہ ہوجاتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کا ارتقاء پیدا نہیں ہوتا فکری وحدت زیادہ سے زیادہ اسی قسم کے نتائج پیدا کرسکتی ہے۔ انسان کی داخلی دنیا میں تغیر پیدا نہیں کرسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ فکری اشتراک کے باوجود باہمی نزاعات آپسی جھگڑے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ باہمی نزاع کی وجہ کیا ہوتی ہے' اس کے متعلق مشہور روسی مفکر' اوسپنسکی لکھتا ہے کہ:

انسانوں کو ایک دوسرے کے سمجھنے میں غلط فہمیاں اس لئے پیدا ہوجاتی ہیں کہ وہ مختلف جذبات کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر ان کے جذبات میں ہم آہنگی پیدا ہوجائے تو وہ ایک دوسرے کو بالکل صحیح طور پر سمجھنے لگ جائیں۔ (Tertium Organum. P-200)۔ وہ اپنے اس نظریہ کی تائید میں کہتا ہے کہ آپ دیکھئے۔ شراب پینے والے ایک دوسرے کے یار ہوتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ شراب ان میں ایک جیسے جذبات پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح بھنگ پینے والے ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں کیونکہ برگِ حشیش ان سب کو ایک ہی قسم کے افلاک کی سیر کراتی ہے۔ لیکن شراب یا بھنگ کے نشے' ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں اور دوسرے ان میں' انسانی فکر معطل اور مسلوب ہوجاتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ جب ان کا نشہ اتر جاتا ہے تو پھر حسب سابق ایک دوسرے کے دشمن یا مخالف ہوجاتے ہیں لیکن قرآنِ کریم' جن جذبات کو وحدتِ فکر کی بنا پر ہم آہنگ کرتا ہے' ان میں یہ نقص نہیں ہوتا۔۔۔ نہ وہ عارضی ہوتے ہیں' اور نہ ہی ان میں فکر مسلوب یا معطل ہوتی ہے۔ بلکہ وہ فکر کو اور جلا دیتے ہیں۔ جن خوش بخت افراد میں اس قسم کی فکری

اور جذباتی وحدت پیدا ہو جاتی ہے' قرآنِ مجید ان کی زندگی کو جنتی زندگی سے تعبیر کرتا ہے' وہ کہتا ہے کہ اس جنتی معاشرہ میں داخل ہونے والوں کی اولین خصوصیت یہ ہوگی کہ: وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (7:43)۔ ان کے دلوں سے غل نکال دیا جائے گا۔ یہ لفظ (غل) ہے تو بہت چھوٹا سا لیکن معانی اور مفہوم کے اعتبار سے یہ بہت وسیع ہے۔ بات سمجھنے کے لئے یوں کہئے کہ ہمارے ہاں اکثر کہا جاتا ہے کہ اس کے دل میں میرے خلاف گرہ بیٹھ گئی ہے جو نکلنے میں ہی نہیں آتی۔ غل کے بنیادی معنی اس قسم کی گرہ سمجھ لیجئے اور اس گرہ سے ایک دوسرے کے خلاف' کینہ' کدورت' حسد' انتقام' عداوت کی جو زہر آلود خباثتیں پیدا ہوتی ہیں' ان سب کو اس میں شامل کر لیجئے۔ یہ ہے مفہوم غل سے۔ جنتی معاشرہ کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل ہونے والے افراد کے دلوں میں کوئی غل نہیں ہوگا۔ اسے جنت میں داخل ہونے سے پہلے ہی دور کر دیا جائے گا۔ یہ گرہیں کھول دی جائیں گی۔۔۔ اسی کیفیت کو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۴۷﴾ (15:47) اس کا عام ترجمہ تو یہی ہے کہ وہ ''تختوں پر ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں کی طرح بیٹھیں گے۔'' لیکن لفظ سرر کا مادہ (س۔ر۔ر) ہے جس کے بنیادی معنی راز کے ہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے (Face to Face) وہی بیٹھ سکتے ہیں جن کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کوئی راز کی بات نہ ہو۔ وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ﴿۷۵﴾ (25:75) وہ جب ایک دوسرے کو ملیں گے تو زندگی بخش سلامتی کی آرزوؤں کے ساتھ ایک دوسرے کو خوش آمدید کہیں گے یہ وہ جنتی معاشرہ ہوگا جو قرآنی رفقاء پر مشتمل ہوگا۔ اس کے برعکس جہنمی معاشرہ میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ ؕ (38:59) وہ منافقت اور ریاکاری سے ایک دوسرے سے نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں لیکن دل سے کبھی خوش آمدید نہیں کہتے۔ وہ ایک دوسرے سے مل کر کبھی خوش نہیں ہوتے اس لئے کہ ان کے دلوں میں غل بھرا ہوتا ہے۔

اس غل کے نکالنے میں عزیزانِ من! ایک اور بھی عمیق نکتہ مضمر ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں' غل کے معنی ہیں دل میں پڑی ہوئی گرہ اور انتزاع کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو اکھیڑ کر یا کھینچ کر نکالنا۔ جیسے پھانس نکال دی جائے۔ دورِ حاضر کے جہنمی معاشرہ میں اعصابی بیماریاں عام ہیں۔ ان سے جو اضطرابی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ ہمارا شب و روز کا تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ ان کیفیات کو جسمانی امراض قرار دے کر ان کے بیسیوں علاج سوچے گئے لیکن ان میں سے کوئی بھی کارگر ثابت نہ ہوا۔ اب ماہرین علم النفس (Psychologist) اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ جسمانی امراض ہیں ہی نہیں انسان کے تحت الشعور میں کوئی ایسا راز پیوست ہو جاتا ہے جسے اس کا شعور فراموش کر چکا ہوتا ہے۔ گہرائی میں جا چھپا ہوا یہ راز' پھانس کی سی شکل اختیار کر لیتا ہے۔۔۔ پھانس یوں تو کچھ بھی نہیں ہوتی لیکن اس کی پیدا کردہ بے چینی اس قدر شدید ہوتی ہے کہ انسان کو لمحہ بھر کے لئے چین نہیں لینے دیتی اب ان' تحت الشعور میں پیوست پھانسوں کا علاج' تجزیۂ نفس کی رُو سے کیا جاتا ہے۔ اس فن کا ماہر کرتا یہ ہے

کہ مریض کے تحت الشعور میں چھپے ہوئے راز کو کسی نہ کسی طرح کھینچ کر باہر لے آتا ہے اور مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ (بالخصوص امریکہ) میں اب یہ طریقِ علاج زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔ اعصابی مریض ہیں بھی زیادہ وہیں۔ ایسا کس کس طریق سے کیا جاتا ہے، میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ لیکن ان سب میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے اور وہ یہ کہ مریض کا اپنے معالج پر کلی اعتماد ہونا چاہئے۔ یہی اعتماد ہے جس کی بنا پر، یہ معالج اس پھانس کو باہر نکال لیتا ہے۔

اس کے بعد پھر آیئے قرآنِ کریم کی اس آیہ جلیلہ کی طرف جس میں کہا گیا ہے کہ: وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (7:43) ان کے تحت الشعور میں پیوست پھانسوں کو نکال باہر کیا جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس جنتی معاشرہ کے افراد میں باہمی اعتماد کی کیفیت یہ ہوگی کہ شعوری راز تو ایک طرف، تحت الشعور میں جاگزیں سرِ مستور بھی ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں ہوں گے۔ یہ کیفیت ہوگی ان کے شرحِ صدر کی۔

عزیزانِ من! اگر آپ کے باہمی تعلقات کی کیفیت ایسی ہے تو پھر سمجھ لیجئے کہ تعلقات، قرآنی رابطہ سے استوار ہیں۔ اگر ایسی کیفیت نہیں تو آپ کا رابطہ باہمی محض فکری اور میکانکی ہے۔ اس سے میکانکی نتائج تو مرتب ہو سکتے ہیں۔ قلب و نظر میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔

آپ ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ آپ جو قرآنی رابطہ کی بنا پر ایک گروپ بننے کے مدعی ہیں، آپ کا یہ رابطہ کس زمرے میں آتا ہے!۔۔۔ قلبی یا محض میکانکی؟

مجھے اس کا علم و احساس ہے کہ آپ احباب جو فکری طور پر اس تنظیم سے وابستہ ہوئے ہیں تو آپ نے تقلیداً ایسا نہیں کیا۔ آپ نے پورے غور و خوض کے بعد اپنی سابقہ (غلط) روشوں کو چھوڑ کر علیٰ وجہِ البصیرت اس راستے کو اختیار کیا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ آپ کا ہر قدم یہ آواز دیتا ہے کہ ؎

حرم کو چھوڑ کے پیرِ حرم کہاں جاؤں　　کہ میں تو دیر و کلیسا سے ہو کے آیا ہوں

اس کے باوجود یہ نہایت ضروری ہے کہ آپ اس فکری رابطے سے مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں۔ یہ بھی دیکھیں کہ آپ کی سیرت و کردار میں وہ تبدیلی پیدا ہوئی ہے یا نہیں جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اگر آپ کے قلوب ایک دوسرے سے جڑ گئے ہیں تو پھر سمجھئے کہ قرآنی رابطہ کا مقصد پورا ہوا ہے، ورنہ نہیں۔۔۔ لیکن اس کے بعد بھی آپ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ آپ باقی مسلمانوں سے الگ کوئی ممتاز افراد بن گئے ہیں۔ یاد رکھئے اپنے آپ کو "حقیقی" اور دوسروں کو "پیدائشی" مسلمان سمجھنا۔ یا اپنے آپ کو صالح اور باقی مسلمانوں کو غیر صالح قرار دینا انسانیت کے نفسیاتی مرض کا مظہر ہے جو احساسِ کمتری سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ: فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝ (53:32)۔ اپنے آپ کو یونہی مزکی نہ سمجھ لیا کرو۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اپنے آپ کو پستیوں میں گرنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ایغو کے اس قسم کے وَساوِس سے محفوظ رکھے۔ آپ کی سیرت و کردار کو ایسا ہونا چاہئے۔ جس سے دنیا خود اندازہ لگا سکے کہ آپ کیسے ہیں۔

خورشید انور (چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

موجودہ مسائل اور قرآنی حل

(اتوار 27 اکتوبر 2024)

جناب صدر محفل، محترم مہمان خصوصی جمیل احمد عدیل صاحب، دنیا کے کونے کونے اور پاکستان کے دور دراز سے تشریف لانے والے بھائیو اور بہنو، اور شہر لاہور کے روایتی مہمان نواز و شمع قرآنی کے پروانو السلام علیکم۔

آج کے کنونشن کے لئے جس موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے

وہ ہے موجودہ مسائل اور قرآنی حل

موضوع کے الفاظ جتنے مختصر ہیں اسکے برعکس اپنے اندر سمندر جیسی گہرائی اور وسعت رکھتے ہیں۔ ہر دور، ہر زمانے اور ہر خطے کے اپنے اپنے مختلف النوع مسائل ہوتے ہیں اور بعض علاقوں اور ادوار کے مسائل تو اتنے انوکھے ہوتے ہیں کہ دوسرے علاقوں اور ادوار کے انسان ان سے یکسر اجنبی ہوتے ہیں۔ لیکن قرآن کے طالب علم ہونے کے ناطے ہم سب کو اس بات کا علم ہے کہ ام المشاکل ازل سے حال تک دو ہیں بلکہ ابد تک دو ہی رہیں گے جن کا قرآن حکیم نے نہ صرف بصراحت ذکر کیا ہے بلکہ ان کا کافی وشافی حل بھی تجویز کیا ہے۔ وہ دو مسائل جس سے انسانیت بلاتفریق، رنگ، نسل، مذہب، ثقافت اور زمانہ ہمیشہ برسرپیکار رہی ہے۔ وہ ہیں جوع اور خوف وحزن۔

یہ دو مسئلے تمام انسانی مسائل کی جڑ ہیں اور باقی جتنے بھی مسائل ہیں ان کی جڑوں کو تلاش کیا جائے تو وہاں یہی دو مسائل نظر آئیں گے۔ دور جدید میں بھی معیاری زندگی اس معاشرے کی ہوتی ہے جہاں ایک تو وہاں معاشی استحکام اور خودمختاری ہوتی ہے اور دوسرا اس میں امن وامان ہوتا ہے یعنی دہشت کا ماحول نہیں ہوتا۔ ایک مثالی معاشرہ ان دونوں عذابوں سے محفوظ ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں نظر دوڑائیں یا اپنے ملک کی حالت دیکھیں تو تمام افراد و اقوام انہی دو مسائل سے نبرد آزما ہیں یعنی معیشت کا مسئلہ اور امن وامان کا مسئلہ اور باقی مسائل دراصل انہی دو کی پیداوار ہیں۔

سب سے پہلے معاشی تنگی یعنی جوع کے عذاب کا ذکر کرتے ہیں:

قرآن کریم نے جنت کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں بھوک یعنی رزق کی تنگی نہیں ہوگی۔ سورۃ طٰہٰ آیات 118 اور

119 میں آدم کو اس کی جنتی زندگی میں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝۱۱۸ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝۱۱۹

اس وقت جس نہج کی زندگی تم بسر کر رہے ہو اس میں کیفیت یہ ہے کہ نہ تمہیں روٹی کی فکر ستاتی ہے نہ کپڑے کی۔ نہ پیاس کا خوف ہے نہ سورج کے تپش کا (تمہارے لئے کھانے کو روٹی، پینے کو پانی، پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان سب کچھ بلا مشقت موجود ہے)۔ یہ تھا وہ معاشرہ جس میں انسان اپنی ابتدائی زندگی میں رہتا تھا اور جس میں وہ اپنے روٹی اور کپڑے کی فکر سے آزاد تھا۔ کسی قوم میں رزق کی فراوانی اللہ تعالیٰ کی نعمت، اور رزق کی تنگی اللہ کا عذاب ہے۔ قرآن کریم کے رو سے جو معاشرہ قائم ہوتا ہے اس میں کوئی فرد بھوکا نہیں رہ سکتا۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ جس نظام میں ہر فرد کو روٹی مل جائے اسے نظام خداوندی اور اس معاشرہ کو جنتی معاشرہ کہا جائے گا۔ نظام خداوندی اور جنتی معاشرہ کی بہت سی خصوصیات ہیں اور جب تک وہ سب موجود نہ ہوں اسے جنتی معاشرہ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جس نظام یا معاشرہ میں لوگوں کو پیٹ بھر کر روٹی نہ ملے اسے نہ نظام خداوندی کہا جا سکتا ہے نہ جنتی معاشرہ۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم ایسے ہنگامی حالات سے گذرے جس میں کچھ وقت کیلئے رزق کی تنگی آ جائے مثلاً جنگ کے زمانے میں۔ لیکن کسی قوم میں نہج زندگی کا ایسا قائم ہو جانا جس میں تمام افراد کو پیٹ بھر کر باطمینان کھانے کو نہ ملے، یہ اللہ کا عذاب ہے اور جو قوم ایسے حالت سے نکلنا نہیں چاہتی وہ جہنم میں رہنا چاہتی ہے۔

قرآن حکیم نے معاشی بدحالی کی وجہ معاشی نظام کو قرار دیا ہے جس سے معاشی ناہمواریاں جنم لیتی ہیں۔ قرآن کریم کے رو سے رزق کے سرچشموں یعنی ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت کا حق نہیں، بلکہ یہ تمام معاشرہ کی اجتماعی ملکیت ہوگی اور ان پر ہر خاص و عام کا مساوی حق ہوگا۔

رزق کے ان سرچشموں یعنی ذرائع پیداوار میں زمین کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اور زمین کی ملکیت کے بارے میں قرآن کریم نے واضح انداز میں کہا ہے کہ الارض اللہ یعنی زمین صرف اللہ کی ہے۔ قرآن حکیم کا یہ اسلوب ہے، کہ جس چیز کی ملکیت اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے اس پر انفرادی ملکیت کا حق نہیں جتایا جا سکتا بلکہ وہ معاشرے اور ملت کی مشترکہ ملکیت ہوتی ہیں۔ جیسے وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ یعنی مساجد اللہ کی ہیں۔ جس طرح کسی مسجد کے بارے میں یہ کہنا ناجائز ہے کہ یہ مسجد میری ہے۔ بالکل اسی طرح یہ بھی ناجائز اور خلاف قرآن ہوگا کہ کوئی یہ کہے کہ یہ زمین میری ملکیت ہے۔ اور اس ملکیت کے ذریعے پھر وہ دوسرے انسانوں کا استحصال کرے۔ اس اصول کے رو سے ایک اسلامی مملکت میں تمام ذرائع پیداوار بشمول زمین پر انفرادی ملکیت حرام ہوگی اور رزق کے تمام سرچشمے اجتماعی ملکیت میں ہونگے۔ لہذا ان ذرائع کو استعمال کر کے جو کمائی ہوگی اس میں سے کمانے والا بقدر ضرورت اپنے لئے رکھے گا اور باقی معاشرے کے دوسرے ضرورتمندوں اور معاشرے کے اجتماعی مفاد کیلئے چھوڑ دے گا۔ قرآن نے سورہ الواقعہ میں اس حقیقت کو بڑے مدلل انداز میں بیان فرمایا ہے

کہ پیداواری صلاحیت میں انسان کا کتنا کردار ہے اور اللہ تعالیٰ کے قانونِ فطرت کا کتنا؟ آیات 64 تا 70 میں ارشاد ہے:

ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿۶۴﴾

یعنی تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے اور ہمارا قانون کیا کچھ کرتا ہے۔ تم زمین میں ہل چلا کر اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے پھل کون اگاتا ہے؟ کیا یہ تم کرتے ہو یا ہمارے قانون کے رو سے ایسا ہوتا ہے؟

لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿۶۵﴾ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۶۷﴾

پھر کھیتی کے اگنے کے بعد اس کی حفاظت کون کرتا ہے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی آفت آ جائے جس سے اگی ہوئی کھیتی تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ اس طرح تہس نہس کہ تم سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ اور ایک دوسرے سے کہنے لگو کہ ہم بالکل تباہ ہو گئے۔ ہم یکسر محروم اور بے نصیب رہ گئے۔ اس کھیتی سے غلہ ملنا تو ایک طرف ہماری محنت اور بیج بھی بیکار میں گئے۔

اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿۶۸﴾

پھر تم ذرا اس پانی پر غور کرو جس پر تمھاری کھیتی ہی کا نہیں بلکہ تمھاری زندگی کا دارومدار ہے۔

ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿۶۹﴾

کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانون ربوبیت ایسا کرتا ہے؟ (2/6)

لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

بادل سمندر کے پانی سے ترتیب پاتے ہیں جو اس قدر کھاری ہوتا ہے کہ نہ پینے کے کام آ سکتا ہے نہ کھیتی باڑی کے) ذرا سوچو کہ اگر بادلوں کا پانی (بارش) ویسا کا ویسا ہی کھاری رہتا تو تم کیا کرتے؟ حیرت ہے کہ تم اس قدر صاف اور سیدھے معاملہ پر اس نہج سے غور کر کے صحیح نتیجے تک کیوں نہیں پہنچتے اور نشوونما کے متعلق اللہ تعالیٰ کے نظام کی قدر شناسی کیوں نہیں کرتے؟

علامہ اقبال نے ان قرآنی حقائق کو بڑے دلنشین انداز میں بیان کیا ہے:

پالتا ہے بیج کو مٹّی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اُٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھّم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نُورِ آفتاب؟
کِس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کِس نے سِکھلائی ہے خُوئے انقلاب؟
دِہ خُدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

اگر قرآنی اصولوں کے مطابق ایسا معاشرہ تشکیل پا جائے جس میں کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہ ہو، کوئی رات کو بھوکا نہ سوتا ہو، ہر فرد دوسرے کے استحصال سے آزاد ہو، تو ایسا جنت نظیر معاشرہ مادہ پرستی، حوس زر اور دولت کے ارتکاز جیسے منفی خصوصیات سے آزاد ہوگا۔

اب دوسرے عذاب یعنی خوف وحزن کا ذکر کرتے ہیں:

خوف اور حزن کو قرآن کریم نے ساتھ ساتھ استعمال کیا ہے۔ خوف سے مراد وہ ڈر اور اندیشہ ہوتا ہے جس کی کوئی ظاہری وجہ موجود ہو۔ مثلاً کسی خطرے کی موجودگی، جبکہ حزن ایک ایسے انجان رنج والم کو کہتے ہیں، جس کی بظاہر کوئی معقول وجہ نہ ہو مثلاً یہ اندیشہ کہ میرے ساتھ بلا وجہ کچھ برا نہ ہو جائے۔

علامہ اقبال کے نظر میں دنیا میں ہر برائی کی جڑ خوف ہے، اور انسان کے ہر اخلاقی جرم کے پیچھے بھی خوف کارفرما ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں انسان اپنے سلسلہ ارتقاء کی بلند ترین سطح پر اس وقت پہنچتا ہے جب وہ خوف اور حزن سے یکسر آزاد ہو جائے۔

انسانی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے اقتدار کی بنیاد ہی خوف پر ہوتی ہے اگر خوف درمیان سے ہٹ جائے تو ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت دونوں کی عالی شان عمارتوں کی بنیادیں لرز کر پل بھر میں ملبے کا ڈھیر بن جائیں گی۔ ملوکیت کے اقتدار کے پیچھے خوف کارفرما ہوتا ہے جس کی وجہ جبر واستبداد ہوتا ہے، جبکہ مذہبی پیشوائیت کے اقتدار کے پیچھے حزن ہوتا ہے جس کی کوئی ظاہری وجہ تو نظر نہیں آتی لیکن اس کی بنیاد کچھ موہوم تصورات ہوتی ہیں جسے انسان ہر دور میں بنا پرکھے نسل در نسل تسلیم کرتا چلا آرہا ہے۔ حتیٰ کہ آج کے جدید دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے بے مثال ترقی کے باوجود انسان اس انجانے خوف یعنی حزن کے زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ خوف کا خاتمہ امن سے ہوتا ہے جبکہ حزن سے نجات اطمینان قلب سے ملتی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم نے سورہ نور کے آیت 55 میں واضح کیا ہے کہ مومنین کے استخلاف فی الارض کے نتیجے میں ان کا خوف امن میں بدل جائے گا۔

وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ

قرآن کریم کے رو سے شرک کی وجہ سے بھی انسان خوف میں مبتلا ہوتا ہے۔ سورہ الانعام آیت 81 میں حضرت ابراہیم علیہ السلام مستبد بادشاہ نمرود سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

وَ كَيْفَ اَخَافُ مَاۤ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَىُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾

بھلا میں ان مٹی کی مورتیوں (اور معبودان باطل) سے کیوں ڈروں جنہیں کوئی اختیار واقتدار حاصل نہیں۔ ڈرنا تو تمہیں چاہیے جو اللہ تعالیٰ جیسی مختار کل ہستی کے ساتھ اوروں کو شریک ٹھہراتے ہو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تم سے کہیں یہ نہیں کہا کہ یہ واقعی میرے اختیارات میں شریک ہیں۔ اگر تمہاری سمجھ میں یہ بات آگئی ہے تو بتاؤ کہ تم میں اور مجھ میں کون امن واطمینان کا زیادہ

حقدار ہے (اور کسے لرزاں و ترساں رہنا چاہیے) تمہیں یا مجھے؟ (خوف شرک کا لازمی نتیجہ ہے۔ توحید سے انسان کے دل میں اس قدر قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا۔)

اس کے برعکس قرآن کریم نے توحید اور صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابعداری کا نتیجہ خوف سے نجات قرار دیا ہے۔

سورہ بقرہ آیت 38 میں ارشاد ہے:

فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٣٨﴾

جو لوگ ہمارے راہنمائی پر عمل پیرا رہیں گے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرینگے وہ ہر قسم کے خوف و ہراس سے محفوظ رہیں گے۔

سورہ حم السجدہ آیت 30 میں ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿٣٠﴾

جو لوگ اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اپنے اس اقرار و ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور دنیا کی کوئی قوت ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں پیدا کرتی تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ اور ان سے کہتی ہیں کہ تم کسی قسم کا خوف نہ کرو اور نہ ہی افسردہ خاطر رہو۔ تمہارے لئے اس جنت کی خوشخبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

قرآن کریم نے جنتی زندگی کی اہم خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔

سورہ الزخرف آیت 68 میں جنت کے مستحق قرار پانے والوں سے کہا جائے گا

يَا عِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ﴿٦٨﴾

اے میرے بندو اب تمہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ سورۃ یونس آیت 62 میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾

اولیاء اللہ کو نہ کسی قسم کا خوف ہوتا ہے نہ حزن۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ قرآن کریم کے رو سے اولیاء اللہ کسی خاص گروہ کا نام نہیں بلکہ مومنین اور متقین ہی کو اولیاء اللہ کہا جاتا ہے۔ ان تصریحات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قرآنی احکام کے نتیجے میں متشکل ہونے والے نظام کا لازمی نتیجہ معاشرے میں خوف کا خاتمہ اور امن و امان کا قیام ہے۔

سورہ نحل آیت 112 میں قرآن نے ان دونوں عذابوں کا ذکر کیا ہے:

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ﴿١١٢﴾

مفہوم: قوموں پر اس قسم کی تباہیاں کیوں اور کب آتی ہیں اسے ایک مثال سے سمجھو۔ ایک بستی تھی جسے خارجی خطرات سے امن اور داخلی کشمکش سے اطمینان حاصل تھا۔ اس کی طرف ہر سمت سے سامان رزق کھینچا چلا آتا تھا۔ اس کے رہنے والے خوش حال اور فارغ البال تھے۔ لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ان بخشائشوں کی ناقدر شناسی کی۔ (بڑے بڑے لوگوں نے انہیں اپنے لئے سمیٹنا اور چھپانا شروع کر دیا)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری ہو گیا۔ فارغ البالی کی جگہ انہیں فاقے آنے لگے اور ان کا امن خطرات سے بدل گیا۔ یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا لایا ہوا تھا۔ اللہ نے اپنی بخشائشیں نہیں روک لی تھیں لیکن انہوں نے اپنے لئے جو غلط نظام قائم کیا یہ اس کا نتیجہ تھا۔

قرآن کریم نے جنت کے دو نمایاں خصوصیات بتائی ہیں ایک تو اس میں رزق کی فراوانی ہوگی اور دوسرا اس میں خوف اور حزن نہیں ہوگا یعنی انسان جنت میں خوشحالی، امن اور سکون کی زندگی گزارے گا۔ اور یہ تو ہم سب کو پتہ ہی ہے کہ قرآن کریم کے رو سے جنت کا آغاز موجودہ زندگی سے ہوتا ہے اور یہ سلسلہ آگے بھی چلتا ہے۔ لیکن جس طرح قرآن کے اصل تعلیم کو عوام سے پوشیدہ رکھنے کیلئے قرآنی اصطلاحات کا مفہوم تبدیل کر دیا گیا اسطرح مسلمانوں کے دل و دماغ میں اس تصور کو پختہ کر کے ایمان کا درجہ دیا گیا کہ یہ دنیا مومن کیلئے قید خانہ اور کافر کیلئے جنت ہے اور جس قدر مسلمان اس دنیا میں غربت اور ذلت کی زندگی گزارے گا اس قدر آخرت میں اس کو شادمانیاں نصیب ہونگی۔ لیکن یہ عقیدہ نہ صرف قرآنی تعلیمات کے یکسر خلاف ہے بلکہ اس کی ضد ہے۔ قرآن حکیم تو مومن ہونے کی نشانی ہی دنیاوی غلبہ کو قرار دیتا ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ (سورۃ آلِ عمران، آیت 139)

سستی نہ کرو اور نہ افسردہ خاطر رہو، تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم مومن ہو۔

بقول علامہ اقبال:

عالَم ہے فقط مومنِ جاں باز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے!

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ (سورۃ یونس، آیت 64)

یعنی ان کیلئے اس دنیا کی زندگی میں بھی خوشخبری ہے اور آخرت کی زندگی میں بھی، یہ اللہ کا قانون ہے جو کبھی بدل نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم نے اس بات کو بھی واضح کیا ہے کہ دنیا کی تنگدستی آخرت کی کامیابی کا ذریعہ ہونا تو درکنار، دنیا کی محکومی آخرت کی تباہی کی ابتداء ہے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ (سورۃ طٰہٰ، آیت 124)

جس نے ہمارے ذکر یعنی قرآن سے اعراض برتا اس کی معیشت تنگ کر دی جائیگی اور قیامت کے دن اسے اندھا اٹھایا

جائے گا۔

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۷۲﴾ (سورۃ بنی اسرائیل، آیت 72)

اور جو شخص اس دنیا میں اندھا ہوگا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔

علامہ اقبال اس حقیقت کو ان اشعار میں بیان کرتا ہے:

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے!

میں اختصار کی خاطر، قرآنی تعلیمات کے حوالے سے، اس موضوع کو سرسری طور پر بیان کر کے صرف ایک جھلک ہی آپ کو دکھا سکا ہوں۔ ورنہ ان دو مسائل کو تفصیل سے بیان کرنے کیلئے تو شائد پورا دن بھی ناکافی ہے۔ بہر حال بھوک اور خوف وحزن ایسے دو امراض ہیں جو انسانی صلاحیتوں کو آگ کی طرح بھسم کر دیتی ہیں۔ اور جب تک انسان معاشی طور پر خودمختار ہو کر معاش کی فکر سے آزاد نہ ہو اور جب تک وہ خوف وحزن کے آہنی زنجیروں میں جکڑا ہو، وہ اپنے مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کرنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ اگلے جہاں کی ارتقائی منازل طے کرنا تو اس کیلئے محض ایک خواب ہوسکتا ہے لیکن اس دنیا میں بھی وہ مغلوب اور مجبور ہو کر ایک بے مقصد اور حیوانی سطح کی زندگی ہی گذارتا ہے، جہاں وہ جانوروں کی طرح صرف زندہ رہنے کیلئے کھاتا ہے اور کھانے کیلئے ہی زندہ رہتا ہے۔ جوع اور خوف وحزن افراد کی طرح اقوام کو بھی صفحۂ ہستی سے مٹا دیتے ہیں، اور ایسی قومیں جو بھوک یعنی معاشی بدحالی اور خوف وحزن کا شکار رہتی ہیں وہ چاہے جتنی بھی پوشیدہ صلاحیتوں کے حامل ہوں، چاہے ان کے پاس معدنیات کے پوشیدہ خزانے ہوں اور چاہے ان کی تعداد دوسرے اقوام کے مقابلہ میں کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، غلامی کی زندگی گزارنے کیلئے مجبور ہوتی ہیں۔

موجود حالات کے تناظر میں اسرائیل کے مقابلے میں عرب ممالک اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ لیکن جب ذوق یقین پیدا ہو جائے تو پھر بے دست و پا مجبور و مقہور بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں فرعون جیسے جابر وقت کو للکارتے ہیں اور اس کو دریائے نیل میں غرق کرنے کا موجب بن جاتے ہیں اور نتیجتاً بھوک اور خوف وحزن سے آزاد ہو جاتے ہیں۔

بقول علامہ اقبال:

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

آپ کے قیمتی وقت اور توجہ کا بہت بہت شکریہ

ڈاکٹر اعجاز رسول (وائس چیئرمین ادارہ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مستقل اقدار اور اُن کی اہمیت

مستقل اقدار دین کے نظام کی حدود متعین کرتی ہیں۔ یہ وہ اقدار ہیں جو کہ پہلے انسان سے لیکر آخری انسان تک اپنی جگہ پر قائم رہیں گی۔ اگر انسان ان پر عمل کر کے دین کا نظام قائم کریں گے تو جس خطہ میں بھی یہ ہوگا وہاں انہیں وہ سب فوائد حاصل ہو جائیں گے جو کہ قرآن نے مختلف آیات میں نوٹ کئے ہیں۔ اگر ان پر عمل نہیں ہوگا تو پھر دنیا کی وہ حالت ہوگی جو کہ ہم 2024 میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔

قرآن کو صرف پڑھنے سے یہ اقدار سامنے نہیں آتی ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ان کا تعلق انسانی ذات کی نشوونما سے ہے۔ جب قرآن کو اس لحاظ سے پڑھا جائے کہ دین کا نظام قائم کرنا ہے اور انسان کے سامنے انسانی نظام کی اضافی اقدار ہوں تو پھر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مستقل اقدار کی ضرورت کیوں ہے۔ ان اقدار کی قرآن میں نشاندہی کرنے کے لئے ایمان کا ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ اللہ کا صحیح تصور اور آخرت کا تصور بمع مکافات کے ((cause & effect)) قرآنی آیات کے پیغام کو اُجاگر کرتے ہیں۔ قرآن بذات خود ایک مستقل قدر ہے۔ شروع سے آخر تک یہ ہمیں بتاتا ہے کہ اگر اس کے مطابق انسانی نظام چلایا جائے گا تو اُس نظام کے حالات اِس طرح ہوں گے۔ یعنی اُس نظام میں انسانی طبیعی ضروریات زندگی کے ساتھ انسانی ذات کی نشوونما کی ضروریات پوری ہوں گی۔ اگر نظام انسانی خواہشات پر مبنی ہوگا تو ایسا نظام صرف طبیعی ضروریات پوری کرے گا اور وہ بھی غیر متوازن طریقے سے۔ اس میں یتیم اور مسکین کی کثرت ہوگی اور فساد اور خون خرابہ ہوگا اور خوف اور حزن کا دور دورہ ہوگا۔

پھر قرآن یہ بھی ہمیں بتاتا ہے کہ دین کے نظام کے قیام کے لئے مومنین کا ہونا لاینفک ہے۔ اور مومنین پیدا نہیں ہوتے انہیں بننا پڑتا ہے۔ یہ بننے کا طریقہ کار اور اس پر عمل وقت کا متقاضی ہے۔ ہر کام ایک منظم طریقہ سے ہوگا۔ اس لئے اس نے رسولؐ اللہ کا ماڈل ہمارے سامنے رکھا ہے جس کے مراحل درج ذیل ہیں۔

1- جب ہم قرآن کا پیغام بحیثیت دین دوسروں کو پیش کرتے ہیں تو آہستہ آہستہ کچھ لوگ اس کی طرف آتے ہیں۔ ان کو دلچسپی پیدا ہوتی ہے لیکن بہت کم ہوتے ہیں جو کہ ایمان کا سوچتے ہیں۔

2- چونکہ طلوع اسلام واحد ادارہ ہے جو کہ دین کے حوالے سے قرآن کا پیغام پیش کرتا ہے۔ اور آج کی دنیا میں علامہ غلام احمد پرویز واحد انسان ہیں جنہوں نے دین کے نظام کے حوالے سے اپنی کتب اور دروس میں نہایت تفصیل سے ذکر کیا

ہے۔ان کی کتب اور دروس کو محفوظ کیا گیا ہے اور آج ہر شخص کی دسترس میں ہیں۔ جو بھی حضرات دنیا میں مسائل سے تنگ آ کر ان کی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں یا ان کے دروس سنتے ہیں ان میں سے چند ضرور اس میں مزید دلچسپی لیتے ہیں۔آج 2024 میں طلوع اسلام کی کتب کا مطالعہ کر کے اور ان کے دروس سن کر کافی حضرات اس فکر سے متفق ہیں اور سوشل میڈیا میں بھی اس بارے میں گفتگو کرتے رہتے ہیں لیکن یہ کام اس حد تک قرآن کے نظام کے لئے کافی نہیں ہے۔

3- جب کہ یہ کام ہو رہا ہے اور جاری رہے گا، دین کے نظام کے لئے اگلا مرحلہ ان لوگوں کو پہچاننا ہے جو کہ اُس طرح کے مومنین بن کر ایک جماعت کا حصہ بن جائیں جنہیں قرآن نے 'یا ایھا الذین آمنوا' کہہ کر پکارا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام کیسے کیا جائے؟ آج کل زوم وغیرہ کی وجہ سے آسان ہو گیا ہے کہ اگر اسطرح کے حضرات آگے آ کر دین کے لئے اپنے آپ کو پیش کریں تو انکو اس کی تربیت دی جا سکتی ہے۔لیکن یہ تعلیم و تربیت کافی صبر، استقامت اور اعمالِ صالحہ کی متقاضی ہوگی۔اس کے لئے پہلا قدم ایمان کو اس طرح سمجھنا اور قبول کرنا ہوگا جس طرح قرآن نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

4- جب یہ مومنین اکٹھے ہو جائیں تو ان کی تعلیم پہلا مرحلہ ہوگا۔جس میں ذات کے مختلف پہلو اور پھر دین کی ضرورت کے متعلق تفصیل مہیا کی جائے گی۔قرآن کی مختلف سورتوں سے زندگی کے متعلق سوچا جائے گا۔ چونکہ قرآن انسان کی نفسیات کے ساتھ بات کرتا ہے اس لئے ان کے متعلق بات چیت ہوگی۔

5- مستقل اقدار اور اللہ کی صفات اس تعلیم و تربیت کا بنیادی حصہ ہوگی۔ان پر عمل کرنے کے طریقہ کار پر غور کر کے مومنین کی ذات کی نشوونما ہوگی اور نشوونما یافتہ مومنین پھر دین کے نظام کے بیج کے طور پر شروع میں کام کریں گے۔

6- جماعت مومنین نے ہر وقت ذہن میں رکھنا ہوتا ہے کہ انہوں نے اللہ کی ذمہ داریوں کو انسانوں کی دنیا میں ادا کرنا ہے۔ یہ ذمہ داریاں ادا نہیں ہو سکتیں جب تک انہوں نے مستقل اقدار اور اسماء الحسنیٰ کے متعلق تعلیم حاصل نہیں کی اور پھر ان کی روشنی میں اپنی ذات کی نشوونما نہ کی ہو۔

مستقل اقدار کی کچھ مثالیں (کچھ اقدار پرویز صاحب کی کتب ''اسلام کیا ہے؟''

اور "Isalm: A challange to Religion" سے ماخوذ ہیں)

1- انسانی ذات

مستقل اقدار میں بلند ترین قدر خود انسانی ذات ہے۔انسانی ذات الوہیاتی توانائی سے ملتی ہے۔اور یہ بات قرآن کے بغیر سمجھی ہی نہیں جا سکتی کیونکہ اسی سے انسان کو اختیار و ارادہ ملتا ہے۔انسانی ذات نے چونکہ طبیعی موت کے بعد بھی زندہ رہنا ہے اس لئے یہ مستقل قدر میں آئے گی جبکہ انسانی جسم اضافی قدر میں آئے گا۔کیونکہ اس نے اپنا کام کر کے موت کے ساتھ اسی طبیعی دنیا میں رہ جانا ہے۔انسانی ذات میں خصوصیت رکھی گئی ہے کہ یہ صالح اعمال سے بڑھتی اور نشوونما پاتی ہے اور اعمال سیئہ سے کمزور ہوتی ہے۔قرآن نے انسانی ذات کو نفس کہہ کر پکارا ہے۔مثلاً آیات دیکھئے (2:256, 59:18-19, 87:14)

2-احترام آدمیت

چونکہ انسانی ذات ہر بچے کو ملتی ہے اس لئے ہر انسان محض انسان ہونے کے ناطے واجب الاحترام قرار پاتا ہے۔ (17:70) احترام آدمیت ایک مستقل قدر ہے جسے کسی اور مقصد کی خاطر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ اسی سے برابری کا احساس جنم لیتا ہے اور اپنی احترامیت کی سمجھ آتی ہے۔ اِس مستقل قدر کے نیچے اور جزئیات مرتب کی جائیں گی جن پر عمل کے ذریعہ احترام آدمیت کو فروغ دیا جائے گا۔

3-اللہ کا تصور

انسانی ذات کے ساتھ اللہ کا تصور بھی مستقل قدر میں آتا ہے۔ قرآن نے جو تصور پیش کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے اور اس تصور سے اللہ کی ذات اپنے اسماء الحسنیٰ کے ساتھ انسانی ذات کے لئے ماڈل بنتی ہے۔ قرآن نے اللہ کی مختلف صفات کا ذکر کیا ہے جن میں سے کچھ صرف اللہ کے لئے مخصوص ہیں جیسے اول۔ آخر۔ ظاہر۔ باطن۔ لیکن کچھ صفات وہ ہیں جن کا سمجھنا اور پھر اپنی ذات سے ان کو ظاہر کرنا ذات کی بلندی اور نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ اسی سے وہ ذات جنم لیتی ہے جس کو نئی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مومن بننے کے لئے اور دین کا نظام چلانے کے لئے ایسی ذات کی ضرورت ہے۔ جو ذات اس تصور کو پوری طرح سمجھ نہیں سکی وہ کبھی بھی وہ ذات نہیں پا سکتی جو کہ دین کے نظام کے لئے ضروری اور لاینفک ہے۔

نوٹ۔ جو صفات صرف اللہ کے لئے مختص ہیں ان کو بھی سمجھنا ضروری ہے تاکہ یہ سمجھ یا تصور مومنین کی ذات کا حصہ بن جائے۔ اسی سے ایمان باللہ میں پختگی آتی ہے۔

4-مدارج بہ اعتبارِ عمل

پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان برابر ہیں لیکن اس کے آگے احترام کے مدارج ان کے اعمال کے مطابق متعین ہوں گے۔ سب سے زیادہ متقی وہ ہوگا جو سب سے زیادہ قوانین خداوندی کا پابند ہوگا۔ (49:13) اور (49:19) اس لئے عزت وتکریم کا معیار جوہر ذاتی ہوگا نہ کہ اضافی نسبتیں۔ ایک اہم بات اس میں یہ ہے کہ مومنین میں اس کا علم ہونا چاہئے کہ کون بہترین متقی ہے تاکہ ان کو دین کے مرکز میں حکومت چلانے کے لئے آگے لایا جائے۔ یہ وہ مومنین ہوں گے جو قرآن کی روشنی میں حکومت کا سارا انتظام کریں گے۔ یہ جمہوریت کے ذریعہ نہیں ہوگا بلکہ ثبوت پر مبنی ہوگا۔ جو خود متقی بن گئے ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ دین کے نظام کے لئے آگے آئیں۔ اگر وہ نہیں آتے تو یہ کمزوری ان کی نشوونما کے لئے اچھی نہیں ہے۔ مومنین ذمہ داری لینے سے نہیں گھبراتے۔

5-قانون مکافاتِ عمل

دین کی عمارت کی بنیاد اس مستقل قدر یا قانون پر ہے۔ کوئی بھی نفس جس کے پاس اختیار وارادہ ہے اس قدر سے بچ نہیں سکتا۔ لیکن یہ قانون بہت بڑا رول ادا کرتا ہے۔ مومنین اِس کے احساس سے اپنے آپ کو بہتر سے بہترین انسان

بناتے ہیں۔ان کے احساس کے بغیر انسانی ذات نشوونما نہیں پاسکتی۔دین کے نظام میں اس کی تعلیم وتربیت ایک اہم ستون کا کام کرے گی۔اس پر عمل کروانے کے لئے مزید گائیڈ لائنز مرتب کی جائیں گی۔اس مستقل قدر میں آیت (45:22) کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور اس قدر کے تحت مزید جزئیات کو مرتب کرنے کی ضرورت ہوگی۔

6-موت

جو بھی انسان دنیا میں آتا ہے اس کے نفس کے پاس طبیعی جسم ہوتا ہے۔موت ہر جسم کو آنی ہوتی ہے۔قرآن نے کہا ہے کہ ہر نفس موت کا مزہ چکھے گا۔موت اس لئے مستقل قدر بنتی ہے کیونکہ اس احساس سے انسان تین باتوں کے متعلق آگاہ ہوتا ہے۔(۱) طبعی موت کا مطلب ہے کہ ہمارے پاس ایک معین مدت ہے اس زندگی میں۔(۲) چونکہ ایک متعین مدت ہے جسے اجل کہتے ہیں اور یہاں کی زندگی کے طریقہ کار اور اعمال پر اگلی زندگی کا انحصار ہے اس لئے اِس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہئے۔(۳) موت چونکہ انسانی طبیعی زندگی کو ختم کر دیتی ہے اور اس کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے اس لئے ایسے اقدامات کرنے کی ضرورت ہے کہ اس طبیعی زندگی کو اچھی طرح گزارنے کے لئے ہدایات مہیا کی جائیں۔اس میں حفظانِ صحت کے اصول وغیرہ شامل ہیں۔اچھا طبی علاج اس کا حصہ ہوگا۔قرآنی اقدار پر عمل کر کے اور ذات کی نشوونما سے طبیعی موت کا خوف زائل ہو جاتا ہے۔خوف اُسی بات کا ہوتا ہے جس میں بے یقینی ہو اور صحیح ایمان بے یقینی کو ختم کر دیتا ہے۔اس سے انسانی نفسیات میں بہت بڑا تغیر پیدا ہوتا ہے۔

7-عدل

ہر ایک کے لئے اس کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں مواقع پیدا کرنا اور سعی وعمل کے لحاظ سے اُن کے مقامات ومدارج متعین کرنا۔محنت کے مطابق معاوضہ دینا۔کسی کے حقوق وواجبات کو سلب نہ کرنا۔اور تمام امور کے فیصلے اس قانون کے مطابق کرنا جو سب پر یکساں طور پر نافذ ہو، عدل کہلاتا ہے۔یقیناً اللہ عدل کا حکم دیتا ہے (16:19) حتیٰ کہ جو لوگ ہم سے دشمنی کریں ان سے بھی عدل کرنا ضروری ہے۔(5:18)

8-آخرت اور اس کی زندگی

انسانی ذات کے ساتھ منسلک آخرت بھی ایک مستقل قدر ہے اور اس کا دین کے نظام کے قائم کرنے میں بہت اہم رول ہے۔قرآن نے کہا ہے کہ طبیعی زندگی جب ختم ہوتی ہے تو ایک مرحلہ ختم ہوتا ہے اور یہ پچھلی سے مختلف ہوگی۔لیکن جس حالت نشوونما میں انسانی ذات طبیعی موت پر زمینی زندگی ختم کرے گی اسی نشوونما کی حالت میں اگلی زندگی شروع کرے گی۔دینی نظام میں یہ مستقل قدر بہت اہم رول ادا کرے گی۔انسانی نظام حیات میں آخرت کا تصور نہیں ہے اس لئے وہاں حساب کتاب کا تصور بھی نہیں ہے۔قانون مکافاتِ عمل پر کسی کا ایمان نہیں ہوتا لیکن دین کے نظام میں آخرت کی زندگی اور اُس پر ایمان ایک حقیقت کے طور پر اپنا کردار ادا کرتی ہے۔

9- جرم کی پاداش

قانون کی دانستہ خلاف ورزی جرم کہلاتی ہے۔ چونکہ اس سے نظام عدل ٹوٹ جاتا ہے اس لئے اِس ذہنیت اور اِس قسم کے اقدام کی روک تھام نہایت ضروری ہے۔ اس روک تھام کو جرم کی سزا یا قصاص کہتے ہیں۔ قصاص کے معنی ہیں مجرم کا پیچھا کر کے اُسے اُس کے کئے کا بدلہ دینا۔ قصاص میں نوع انسانی کی زندگی کا راز پوشیدہ ہے (2:179) لیکن ہر قصاص انفرادی چیز نہیں۔ یہ دینی حکومت کا فریضہ ہے۔ مثلاً جرمِ قتل کے سلسلہ میں قرآن نے کہا ہے کہ نظام اس کی مدد کرے (17:33) اس سلسلہ میں یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ہر انسان کو تسلی ہونی چاہئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ صحت مند لمبی عمر اس دنیا میں گزار سکے تاکہ متقی بن کر آخرت کی زندگی بہت اونچی سطح پر شروع کر سکے۔ جرائم ختم ہو جائیں یہ مقصد ہوگا دینی نظام کا۔

10- کسی کی ذمہ داری کوئی دوسرا نہیں اٹھائے گا

عدل کا تقاضہ ہے کہ ہر فرد اپنی اپنی ذمہ داری خود اٹھائے۔ بلکہ یہی ذمہ داری خوشی سے اٹھائے اور دین کے نظام کی ذمہ داری ہے کہ اِس سلسلہ میں افراد کی تعلیم و تربیت سے مدد بھی کرے۔ قرآن نے اس مستقل قدر کا ذکر (6:164 میں کیا ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والے دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اس میں دونوں پہلو آتے ہیں یعنی طبیعی جسم اور انسانی ذات۔ ہر فردِ معاشرہ کو علم ہوگا کہ انسانی جسم کام کرنے کے لئے دیا گیا ہے تاکہ انسانی اعمال سے ذات کی نشوونما ہو جائے۔ فارغ رہنے سے یا کام نہ کرنے سے انسانی ذات کبھی بھی نشوونما نہیں پا سکتی۔ اور یہ اعمال انسان کو خوشی سے کرنے چاہئے تاکہ دین کا نظام فروغ پا سکے۔

11- ناروائی ظلم

خود ظلم نہ کرنا اور ظلم کی روک تھام کرنا۔ قرآن نے (2:279) میں اس کے متعلق کہا ہے۔ ظلم کا مطلب ہوتا ہے کہ جو چیز جہاں پر ہونی چاہئے وہ وہاں پر نہ ہو۔ مثلا معاشرہ میں کوئی یتیم اور مسکین انسان نہیں ہونا چاہئے۔ اگر ہے تو وہ معاشرہ ظلم پر مبنی ہے۔

12- احسان

اس کے معنی ہیں حسن پیدا کرنا۔ حسن توازن ہی کا دوسرا نام ہے۔ لہٰذا جس کا توازن بگڑ جائے اس کے توازن کو درست کر دینا۔ قرآن نے عدل کے ساتھ احسان کا حکم دیا ہے (16:90) عدل بدلے اور معاوضہ کا متقاضی ہوتا ہے۔ لیکن احسان میں کسی کمی کو دور کر کے اُس کا توازن قائم کر دینا۔ مثلاً قرآن نے کہا ہے (55:60) کسی کا توازن ٹھیک کرنا اُس احسان کا بدلا بن گیا۔ غیر توازن کی نشاندہی کرنا اس قدر کا اہم حصہ ہے۔ اس مستقل قدر کے تحت مزید جزئیات تشکیل کی جائیں گی تاکہ اس پر مؤثر طریقہ سے عمل درآمد ہو سکے۔ اس قدر کی تعمیل میں دل کی رضامندی شامل ہوگی۔

13- کوئی انسان کسی کا غلام اور محکوم نہیں ہوسکتا

احترام آدمیت کا لازمی نتیجہ ہے کہ کوئی انسان دوسرے انسان کا غلام یا محکوم نہ ہو۔ ہر ایک کو یکساں آزادی حاصل ہو۔ قرآن کا اس بارے میں واضح فیصلہ ہے (3:79) دین کے نظام میں اسی لئے حکمرانی اللہ کی کتاب کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جماعت مومنین قرآن کی روشنی میں نظام کو چلاتے ہیں اور باہمی مشورہ سے تمام امور کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اس نظام میں ہر مسئلہ کا حل قرآن کی روشنی میں ہوتا ہے۔ اس میں ہر معاملہ میں اللہ (کے قانون) کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾ (3:109) اس میں ایک اور اہم نقطہ یہ ہے کہ کسی بھی مومن کا جی نہیں چاہتا کہ وہ کسی دوسرے انسان پر اپنا حکم چلائے۔ اسے چونکہ ذات کی نشوونما کی سمجھ آ گئی ہوتی ہے کیونکہ اس کے ہاں نشوونما ذات ہوتی ہے، اس لئے وہ کبھی بھی دوسرے پر حکم چلانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس میں ہر فیصلہ اللہ کی کتاب کے مطابق ہوتا ہے اور یہ سب دل کی رضامندی سے ہوتا ہے۔

14- امر بالمعروف والنہی عن المنکر

قرآن نے جماعت مومنین کا یہ فرض بتایا ہے اور یہ معاشرہ میں اچھائی پھیلانے اور برائی روکنے کے لئے اہم مستقل قدر ہے۔ دین کے نظام میں ہر ایک کو اقدار کا علم ہوگا اور وہ ایک دوسرے کو حق کی تلقین کریں گے اور آہستہ آہستہ پورا معاشرہ پُرامن ہوگا اور خوف سے آزاد ہو جائے گا۔ اس میں برائی کرنے والے کو آرام سے بتا دیا جائے گا کہ اس سے معاشرہ میں توازن قائم نہیں رہتا۔ اس کی تعلیم و تربیت ملے گی۔ یہاں ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک فرد دوسرے پر جاسوسی کرے گا۔ اس مستقل قدر کے نیچے طریقہء کار بنایا جائے گا کہ کس طرح اس پر عمل ہوگا۔ مومنین کبھی بھی دوسروں کی دل آزاری نہیں کرتے۔

15- قانون کی اطاعت

معاشرہ میں امن وامان کے لئے کچھ پابندیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ پابندیاں خواہش کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔ دین کے نظام میں بھی قانون وحی کی اقدار کی صورت میں سامنے آئے گا اور اس کی پابندی ایک مستقل قدر ہے۔ ان کی اطاعت سے دین کا نظام پھلتا پھولتا ہے۔ یہ اطاعت دل سے ہونی چاہئے یہ سوچتے ہوئے کہ یہ قانون کی اطاعت قرآن کی اطاعت ہے۔ یعنی اللہ کی اطاعت۔ (3:74) اس طرف اشارہ کرتی ہے اور آیت (5:44) اس کی محکمیت کی طرف ہدایت دیتی ہے۔ اللہ کے قوانین کی اطاعت سے انسانی ذات نشوونما پاتی ہے اور معاشرہ جس میں یہ اطاعت ہو وہ جنت کی عکاسی کرتا ہے۔

16- تنذیر اور انتباہ

یہ بھی ایک اہم قدر ہے جس کا تعلق قانونِ مکافاتِ عمل کے ساتھ ہے۔ قرآن ہمیں ((Warning)) دیتا ہے کہ جو بھی ((choice)) ہم بناتے ہیں اُس کے اثرات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ متقی بننے میں یہ راز پوشیدہ ہے کہ زندگی خطرات سے

بچ کر گزاری جائے۔ مومنین نہ صرف اپنے اعمال کے نگران ہوتے ہیں بلکہ دوسرے انسانوں کے اعمال پر بھی نظر رکھتے ہیں اور جہاں کہیں بھی کوئی غلط اعمال دیکھتے ہیں ان کے متعلق ((warn)) کر دیتے ہیں۔ قرآن میں اس مستقل قدر پر بہت ساری آیات ہیں۔ مثلاً کہا ہے کہ کوئی قوم تباہ نہیں ہوتی جب تک اُسکو وارننگ نہ مل گئی ہو۔ ہر وارننگ ان کے اعمال کے ذریعہ بھی ہوسکتی ہے۔ مثلاً آگ میں انگلی ڈالنے سے یہ جل جائے گی اور یہ جلنا وارننگ بن جائے گی۔ الفاظ کے ذریعہ بھی وارننگ دی جاتی ہے۔ یہ تعلیم وتربیت کا حصہ ہونی چاہئے۔ اس مستقل قدر کی جزئیات نظام میں باہمی مشاورت سے طے ہوں گی۔

17- ہر کام کا نتیجہ

قانون کی اطاعت کے معنی ہیں کہ کسی شخص کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہ رہنے پائے۔ اچھے کام کا اچھا نتیجہ اور برے کام کا برا نتیجہ۔ اچھے کام سے مراد ہے قانون اللہ کے مطابق کام کرنا اور برے کام کا مطلب ہے، اِس قانون کی خلاف ورزی کرنا۔ انسانی نظام کے تحت پولیس اور عدالت کا نظام اس سے نپٹتا ہے، لیکن دین کے نظام کے پیچھے اس کے ساتھ قرآن کی تعلیم وتربیب بھی شامل ہوتی ہے۔ انسان کا ہر عمل اس کی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے، اس لئے ہر فرد کے علم میں ہونا چاہئے کہ یہ کس طرح اسکی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے لئے انسانی شعور کی وسعت بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان دین کے نظام میں اپنے خیالات اور اعمال کی پوری پوری ذمہ داری لے اور ہر ذمہ داری بطیب خاطر ہونی چاہئے۔ یہ زندگی کے اعلیٰ مقصد کا حصہ بن جائیگی۔ آیات ((99:7-8) (10:15) (45:22) (40:19)وغیر اس سلسلہ میں مدد کرتی ہیں خاص کر آیت (45:22)

18- نظام عدل کے لئے مستقل اقدار

ہر عدل اگرچہ (ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ) اللہ کا کائناتی نظام کے مطابق کارفرما ہوتا ہے۔ لیکن انسانی زندگی میں اِس عدل کو قائم کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ طبیعی زندگی میں بھی اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ خاص طور پر ان افراد معاشرہ کی طرف مسائل کھڑے ہونگے جو کہ ایمان نہیں لاتے یا ابھی فیصلہ نہیں کر پاتے کہ اُن کو ایمان لانا چاہئے یا پھر دِل میں کفر چھپائے ہوئے افراد بھی ہوں گے اور اُن کو جرائم سے روکنے کے لئے سزا وغیرہ کے لئے نظام عدل اور پولیس کی ضرورت رہے گی۔ اس سلسلہ میں مثلاً درج ذیل مستقل اقدار کی ضرورت ہوگی۔

ا۔ حق کو جانتے بوجھتے کبھی نہ چھپایا جائے۔ (2:42)۔ افراد معاشرہ میں جرات پیدا ہونی چاہئے کہ غلط کام کے خلاف کھڑے ہوں اور حق بات کو آگے لے کر جائیں۔ برائی کو دیکھ کر خاموشی اختیار نہ کریں کہ یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ دین کے نظام میں حق ہر ایک کا مسئلہ ہوتا ہے۔

ب۔ حق اور باطل میں التباس ((mixing, confusion))نہیں ہونا چاہئے ((2:42))۔ غیر دینی نظام میں جھوٹ عام ہوتا ہے مثلاً میڈیا وغیرہ پر ہر قسم کا غلط پراپیگنڈا کیا جاتا ہے جس سے انسانی ذہن پر بہت غلط اثر پڑتا ہے۔ قرآن اِس سے متنبہ کرتا ہے کہ برائی اگر پھلتی جائے تو پھر کوئی فرد بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ (76:7)

ج۔ شہادت کو کبھی بھی چھپایا نہ جائے (2:282)

د۔ کسی قسم کے لالچ یا ذاتی منفعت یا بغض وعداوت کے خیال کے بغیر محض حق کی خاطر سچی شہادت دی جائے (4:135) اس کے لئے تعلیم وتربیت دی جائے گی۔

ھ۔ مجرموں کی طرف سے وکالت نہیں کی جاسکتی۔ نہ ہی مجرمین (48:5) (4:107) (68:17) کی پشت پناہی کی جاسکے گی۔ سارا عدالتی نظام آہستہ آہستہ مستقل اقدار کے نیچے لایا جائے گا۔ اس میں پہلے ذہنی تعلیم وتربیت ہوگی تاکہ سب افراد اس کی غایت اور مقصد کو سمجھ سکیں۔

19- قانون کے مطابق چلانا

معاشرہ میں ہر فرد اور خود حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ ہر ایک کو اللہ کے قانون کے مطاق چلنے کا حکم دے اور قانون کے خلاف ورزی سے روکے۔ نظام اس طرح منظم کیا جائے کہ اُس میں ہر فرد قانون کی اطاعت کو اپنے فائدے میں خیال کرے۔ یہ جماعتِ مومنین کے فریضہ میں شامل ہے (3:110) وہ جماعتِ مومنین بن ہی نہیں سکتی اس کام کو کئے بغیر۔ یعنی اچھائی کی طرف بلانا اور برائی سے روکنا۔

20- لاقانونیت نہ پھیلائی جائے

لاقانونیت پھیلانا یا اللہ کے قانون سے سرکشی برتنا قرآن کی اصطلاح میں فساد کہلاتا ہے اور بہت بڑا جرم ہے (2:205) ان لوگوں کو جو فساد برپا کریں سخت سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔ (5:159)

21- مشاورتی نظامِ حکومت

دین کے صحیح نظام حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ مستقل اقدار کی بنا پر معاشرہ کی تشکیل کرے۔ لیکن مستقل اقدار عام طور پر بنیادی اصول یا حدود متعین کرتی ہیں۔ اِن اصولوں کی جزئیات ہر زمانے کے اپنے حالات کے مطابق خود متعین کرنی ہوتی ہیں۔ اِن اصولوں کی جزئیات ہر زمانے کے اپنے حالات کے مطابق خود متعین کرنی ہوتی ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ کام کسی ایک فرد کے سپرد نہ کیا جائے بلکہ نمائندگان ملت کے باہمی مشورہ سے سرانجام پائے وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38)۔ رسولؐ اللہ سے بھی یہی کہا گیا تھا وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (3:159)۔ یہ مشاورت اکثریت کی بنیاد پر نہیں ہوگی بلکہ مستقل اقدار کے اندر رہتے ہوئے ہوگی۔ اختلافات کے بغیر ہوگی۔

22- امورِ مملکت نااہلوں کے سپرد نہ کئے جائیں

دین کے نظام میں یہ اصول سامنے رکھا جائے گا۔ تم میں سے افضل وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے (49:13) قرآن نے حکم دیا ہے کہ (4:58) امانات ان کے سپرد کرو جو اُن کے اہل ہوں۔ اگر اہل افراد مہیا نہیں ہیں تو ان کی تعلیم وتربیت کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی لئے دین کے نظام کے قائم کرنے سے پہلے مناسب افراد جو مومن ہیں ان کی تعلیم۔ تربیت اور ذات کی نشوونما کا بندوبست کیا جائے۔ اس میں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون لوگ ان کی یہ تعلیم وتربیت کریں گے (62:2) صاف ظاہر ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی اپنی علمی سطح بہت بلند ہو اور ان کی ذات بھی کافی اونچے لیول کی نشوونما

یافتہ ہو اور وہ قرآن کی مستقل اقدار سے کبھی بھی سرکشی نہ برتنے والے ہوں۔ ان کے قول اور فعل میں تضاد نہ ہو اور اعمالِ صالحہ کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتے ہوں۔

23- رزق کی ذمہ داری معاشرہ پر ہے

رزق کی ذمہ داری معاشرہ پر ہے۔ دین کے نظام میں بنیادی مقصد تمام افراد کی بنیادی ضروریات زندگی پوری کرنا ایک اہم فریضہ ہے۔ ہر فرد کی بنیادی ضرورت پوری کئے بغیر زندگی کے اعلیٰ مقصد پر کام کافی ناممکن ہوتا ہے۔ اللہ نے یہ ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے (11:6) اور یہ ذمہ داری انسانوں کی دُنیا میں جماعت مومنین کے ہاتھوں سے پوری ہوتی ہے۔ جو مملکت اللہ کے قوانین کے نفاذ کے لئے وجود میں آتی ہے وہ اِن تمام ذمہ داریوں کو اپنے اوپر لیتی ہے جنہیں اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ (6:151)

24- ذرائع رزق

جو نظام اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے یہ ضروری ہے کہ ذرائع رزق اُسکی تحویل میں رہیں اور وہ نظام ان کی مناسب طور پر قرآن کی روشنی میں اُنکی نگہداشت بھی کرے۔ اسی لئے قرآن نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ذرائع رزق کو تمام انسانوں کے فائدہ کے لئے پیدا کیا گیا ہے (2:29) اس میں چند ہاتھوں میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زمین میں سب کے لئے سامانِ معاش رکھا گیا ہے (7:10) یہاں یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ انسانی زندگی کا مقصد اپنے اندر ایک نئی زندگی پیدا کرنا ہے صرف اپنے جسم کی نشوونما نہیں ہے۔ اس نئی زندگی کی ضرورت اس لئے ہے کہ یہاں کی زندگی اچھی گزرے اور اگلی زندگی کے لئے بھی ذات تیار ہو جائے۔ جن انسانی نگاہوں میں آخرت کا صحیح تصور نہیں ہوتا اس لئے ان میں کبھی بھی توازن پیدا نہیں ہو سکتا۔

25- زائد از ضرورت

قرآن نے دین کے حوالے سے یہ بھی کہا ہے کہ اس میں ضرورت سے زیادہ دوسروں کی فلاح کے لئے کھلا رکھنا چاہئے۔ جب سب کی ضروریات دین کا نظام پوری کرنے لگ جائے تو انسان کو روزی اور ضروریاتِ زندگی کی پریشانی سے نجات مل جانی چاہئے تاکہ انسان زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے لئے کوشش کر سکے۔ قرآن نے اس سلسلہ میں..... ہمیں سوال جواب کے ساتھ کہہ دیا کہ جو کچھ ضروت سے زیادہ ہے وہ اپنے پاس نہ رکھیں۔ یہ ایک اہم حصہ ہے ذات کی نشوونما کا۔ انسانی نظام حکومت میں افراد کی ساری زندگی بنیادی ضروریات پوری کرنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ اور جن کے پاس زیادہ اکٹھا ہو جاتا ہے وہ زیادہ کی ہوس میں پریشان رہتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں انسانی ذات کی نشوونما کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے اگلی زندگی اور اس کی خوشگواریاں اس ساری کشمکش میں کہیں بھی نہیں آتیں۔ ظاہر ہے کہ جسکا انسان نے سوچا ہی نہیں وہ کبھی بھی ذات کا حصہ نہیں بن سکتا۔

26- حفاظتِ عصمت

عصمت کی حفاظت سے مراد ہے کہ مرد اور عورت کا جنسی تعلق صرف نکاح سے قائم ہو۔ اس طریقہ سے جو کہ معروف ہو اور مملکت کی طرف سے مقرر ہو۔ اس طریقہ کے علاوہ جنسی تعلق کو زنا کہا گیا ہے۔ جس کے قریب جانے سے روکا گیا ہے۔ (17:32) اس کی سزا بھی قرآن نے مقرر کی ہے (24:2) اس میں ضرورت اِس امر کی ہے کہ سوسائٹی میں تعلیم کے ذریعہ

شادی اور بچوں کی اہمیت پر زور دیا جائے۔ انسانی ذہن کے خیالات کے سلسلہ میں مناسب تعلیم کی اشد ضرورت ہے اور سب افراد کے خیالات کے متعلق تربیت کی ضرورت ہے۔ جنسی بے راہ روی سے افراد کی صلاحیتوں پر بُرا اثر پڑتا ہے اور معاشرہ میں حالات خراب ہوتے ہیں۔ اس سے انسانی ذات کمزور ہو جاتی ہے آیات (24:33),(25:68) بھی دیکھ لیں۔

27- نوعِ انسانی امت واحدہ ہے

چونکہ تمام انسان 'نفس واحدۃ' سے پیدا ہوئے ہیں (4:11) اس لئے اصل کے اعتبار (origin) سے تمام انسان ایک ہی برادری کے افراد اور ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں۔ لہٰذا تمام نوع انسان کا ایک عالمگیر برادری اور ایک قوم کی حیثیت سے رہنا مقصود حیات ہے (10:19)۔ اختلافات مٹانے کے لے اللہ نے وحی بھیجی ہے جو کہ اب قرآن میں محفوظ ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن نے اس طرف اشارہ بھی کیا ہے (2:213) اختلاقات مٹانے کا طریقہء کار یہ ہے کہ زندگی کے اعلیٰ مقصد کا سوچا جائے اور پھر اس مقصد کو سامنے رکھ کر آپس کے اختلافات کو دور کیا جائے۔ یہ اسی صورت ممکن ہے اگر ایک جماعت مومنین وجود میں آ کر ماڈل قوم تیار کرے۔ انسان اپنی زندگی کے مسائل کا حل چاہتا ہے اور اگر اُسے بہتر حل پیش کیا جائے جس میں اس کی ذات اور موت کا خوف دور کرنے کی بات ہو تو یہ بہت سارے انسانوں کو اپیل کر سکتی ہے (10:57) میں قرآن کی اہمیت کا ذکر ہے کہ یہ انسان کے نفسیاتی مسائل کو بھی حل کر سکتا ہے جن کا تعلق انسان کی ذات اور اس کی نشوونما کے ساتھ ہے۔ انسانی ذات کے لیول پر مرد اور عورت برابر ہوتے ہیں۔ طبیعی طور پر دونوں کے رول مختلف ہیں۔

28- انسانیت کے لئے نفع بخش اور تعاون

فلاح و بہبود کے کاموں کو پارٹیوں۔ گروہوں، ملکوں اور قوموں کے دائرہ میں محدود کر دینا مستقل اقدار کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔ قرآن کی رُو سے دوام صرف اسی عمل کو ہے جو تمام انسانیت کی نفع بخشی کے لئے کیا جائے۔ (13:17) اس کے لئے وہ پہلا قدم یہ تجویز کرتا ہے کہ تمام انسان (بلا تمیز رنگ و نسل اور بلا تفریق قوم و ملک) تمام ایسے امور میں باہمی تعاون سے کام لیں جو انسانیت کے لئے کشاد اور مستقل اقدار کی نگہداشت میں مدد و معاون ہوں۔ اور ایسے کاموں میں کبھی ایک دوسرے کی مدد نہ کریں جو انسانیت میں تخریب کا باعث بنیں (5:2)

29- معیارِ تفریق

قرآن تمام انسانوں کی تفریق و تقسیم اس معیار کی رو سے کرتا ہے کہ جو مستقل اقدار کو قبول کریں اور ایمان لا کر ایک قوم کے افراد بن جائیں۔ اس میں طاغوتی نظام سے انکار بہت ضروری ہے۔ اس کو ہم دو قومی نظریہ بھی کہیں گے۔

جو لوگ اس سے انکار کر دیں اور طاغوتی نظام کو قبول کر کے اس میں رہنا پسند کریں وہ دوسری قوم کے افراد کہلائیں گے۔ اس قومیت کا معیار نظریہ ((Ideology)) پر ہے۔ قرآن نے اس کو صاف طور پر بتا دیا (64:2) ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آ گیا ہے اب جس کا جی چاہے اُسے قبول کرے اور جس کا جی چاہے اس روش سے انکار کر دے (18:29)

(بقیہ حصہ صفحہ نمبر: 34 پر ملاحظہ کریں)

سالانہ کنونشن ادارہ طلوعِ اسلام

سماعت گاہ کے مناظر

منعقدہ مورخہ 26 اکتوبر 2024ء










سماعت گاہ کے مناظر











رابطۂ باہمی اور مجلسِ استفسارات

26 اکتوبر 2024ء










شام 26 اکتوبر 2024ء



خصوصی خطاب از ڈاکٹر اعجاز رسول (گلاسگو)



آصف جلیل نظامت کے فرائض ادا کرتے ہوئے



ڈاکٹر انعام الحق اظہارِ خیال کرتے ہوئے



شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ صدر محفل



خورشید انور (چیئرمین ادارہ) اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے



عمران شاہد اظہارِ خیال کرتے ہوئے





حاضرین مجلس کا ایک منظر

سالانہ کنونشن ادارہ طلوعِ اسلام
(سیمینار)

منعقدہ مورخہ 27 اکتوبر 2024ء



محمد عمر نظامت کے فرائض ادا کرتے ہوئے



حاضرینِ مجلس کا ایک منظر



عبدالسلام تلاوتِ قرآن اور مفہوم پڑھتے ہوئے



محمد ضحاک کلامِ اقبالِ پیش کرتے ہوئے



حاضرینِ مجلس کا ایک منظر



صوبیہ حمید مقالہ پڑھتے ہوئے



سامعینِ کرام



حاضرینِ مجلس کا ایک منظر



سماعت گاہ کے مناظر



اسٹیج کا ایک منظر (دائیں سے بائیں) خورشید انور، جمیل احمد عدیل، ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول



سماعت گاہ کے مناظر



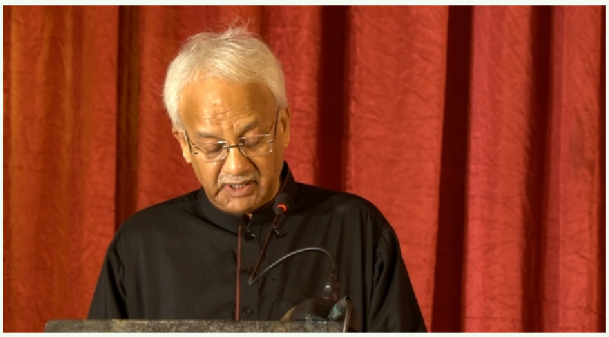
آمنہ لطیف خیالات کا اظہار کرتے ہوئے



پروفیسر ڈاکٹر صالحہ نغمی مضمون پیش کرتے ہوئے



سماعت گاہ کا ایک منظر



خالد بشیر فاروقی اپنا مضمون پیش کرتے ہوئے



خورشید انور چیئرمین ادارہ اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے



ارشد علی نمائندہ بزم سوات اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے



حاضرینِ مجلس کا ایک منظر



عافیہ فاروقی مضمون پڑھتے ہوئے



ڈاکٹر اعجاز رسول (وائس چیئرمین) خطاب کرتے ہوئے



حاضرینِ مجلس کا ایک منظر



وسیم احمد اپنا خیالات کا اظہار کرتے ہوئے



محمد عامر نمائندہ بزم کراچی اظہارِ خیال کرتے ہوئے



عقیل حیدر اظہارِ خیال کرتے ہوئے



جمیل احمد عدیل مہمانِ خصوصی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے



عمران شاہد اور اقبال ادریس خان



صدرِ مجلس، ڈاکٹر انعام الحق صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے

30-دین کے معاملے میں کوئی زبردستی (اکراہ) نہیں

مستقل اقدار کو کسی سے منوایا نہیں جا سکتا۔ ماننا یا انکار کرنا انسان کے دل کے فیصلے کا نام ہے۔ جو فیصلہ اپنی مرضی سے بغیر کسی دباؤ کے کیا جائے وہی اس انسان کا فیصلہ کہلا سکتا ہے۔ اس لئے دین کے معاملے میں زبردستی بالکل نہیں ہو سکتی نہ کسی کو زبردستی مومن بنایا جا سکتا ہے۔ مثلاً قرآن نے اعلان کر کے کہہ دیا ہے (لا اکراہ فی الدین) (2:256)۔ سیدھی اور غلط راہ صاف طور پر بتا دی گئی ہے، اس لئے جس کا جی چاہے جو بھی راستہ اختیار کرنا ہے کر لے (18:29) یہاں پر یہ بھی علم ہونا چاہئے کہ دین کے نظام کی بنیاد ہی دل اور دماغ کی تبدیلی ہے۔ خاص طور پر اُن مومنین کی جو کہ اس نظام کے مرکز کو تشکیل دیتے ہیں۔ انہی سے اللہ نے زمین میں اقتدار کا وعدہ کیا ہے (24:55)

نوٹ: کوئی بھی فرد مومن نہیں کہلا سکتا جو اپنی مرضی سے (دماغ + دِل) ایمان نہ لایا ہو اور جس کا جی نہ چاہے کہ وہ جماعت مومنین کا دل کی رضامندی سے ساتھی بنے۔

31-معاوضہ محنت کا ہے سرمایہ کا نہیں

اس مستقل قدر کے اوپر دین کا معاشی نظام قائم ہوتا ہے۔ اللہ نے انسان کو طبیعی اور دماغی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ ان کا استعمال انسان کی قابلیتوں کو بڑھاتا ہے۔ اگر انسان ان کو استعمال نہیں کرتا اور دوسروں کی محنت پر گزارا کرتا ہے تو پھر وہ قابلیتیں کیسے باہر آئیں گی جو کہ محنت سے منسلک ہیں۔ سارا قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسانی ذات صالح اعمال سے نشوونما پاتی ہے۔ دوسروں کی محنت کا استحصال کرنا صالح اعمال میں شامل ہو ہی نہیں سکتا۔ ایمان لانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ دوسروں کی مدد کرنے کے لئے تیار ہونا نہ کہ دوسروں کے پاس جو کچھ ہے اس کو بھی چھین کر لے جانا۔ سارا سرمایہ دارانہ نظام اس پر چلتا ہے کہ محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا ماحصل کوئی اور لے جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں آیات دیکھئے مثلاً (53:38-39) , (16:71)

32-اچھے اعمال بُرے اعمال کے اثر کو زائل کر سکتے ہیں

انسان ایمان لانے سے پہلے غلطیاں کرتا ہے۔ اور جب ایمان لا کر قرآن کی حقیقتوں پر ایمان لے آتا ہے تو اس کو احساس ہوتا ہے کہ اُس نے بہت سارے غلط کام کئے ہیں۔ یہاں قرآن اس کا حل یہ بتاتا ہے کہ اسے چاہئے کہ وہ بہت سے صالح اعمال کر کے اپنی ذات سے ان غلطیوں کا اثر مٹا دے۔ کیونکہ انسانی ذات میں توازن اچھے اعمال کے ذریعے ہی آ سکتا ہے۔ اس کی ذات کی میزان میں اچھے کاموں کا پلڑا بھاری ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں آیات دیکھئے ((39:53-55) (11:114)) اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کچھ غلط خواہش کے پیچھے کر لیا جائے اور پھر اس کو زائل کرنے کی کوشش کی جائے۔

33-ایمان اور اعمالِ صالحہ

قرآن نے اس پر ہر وقت زور دیا ہے اور اس کی وجہ سے زاویہ نگاہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس سے انسان کے اندر ایسی تبدیلی آتی ہے جو کہ ایمان کے بغیر آ ہی نہیں سکتی۔ قرآن نے شروع میں متقین اور ایمان کا ذکر کر دیا ہے جس سے قرآن کی ہدایت کے لئے دروازہ کھل جاتا ہے۔ اسی ایمان کے اندر انسانی تخلیق کا مقصد بھی مضمر ہے انسان کو ایمان کیوں لانا چاہئے؟

اس لئے کہ جب دنیا کا کنٹرول اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو کہ شیطان اور ابلیس کے پیچھے چلتے ہیں تو دنیا ۲۰۲۴ جیسی ہوگی جس میں ہر طرف افراتفری اور بے نظمی کا دور دورہ ہوگا۔ جہاں انسانیت ہر لیول پر بٹی ہوگی اور خوف اور حزن ہر جگہ موجود ہو گا بالکل اسی طرح جس طرح ہوا ہر جگہ موجود ہے۔

اعمال صالحہ کا بہت گہرا تعلق ہے ایمان کے ساتھ۔ انسان کے اندر بہت ساری مضمر صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ کچھ صلاحیتیں انسانی نظام کے نیچے باہر آ جاتی ہیں مثلاً اکتساب رزق کے لئے کوششیں۔ تعلیم حاصل کرنا۔ خاندان وغیرہ کا خیال کرنا۔ حکومت کرنا اور نظم ونسق کا بندوبست کرنا۔ وغیرہ۔ لیکن یہ صلاحیتیں تو صرف طبیعی زندگی کے مفاد کے ساتھ متعلق ہیں۔ وہ صلاحیتیں جن کا تعلق انسانی ذات اور دین کے نظام کو قائم کرنے کے ساتھ ہے وہ چھپی ہی رہ جائیں گی اگر انسان نے ایمان لانے کے بعد اپنی زندگی کا اعلیٰ مقصد قائم نہیں کیا اور یتیم اور مسکین کا نہیں سوچا۔ اس سوچنے کے پیچھے ایک گہری نفسیاتی سوچ ہے جو کہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ ایسے انسان خودغرض ہوتے ہیں اور ان کے سامنے صرف ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی کمزوری ہے جس کی وجہ سے ایسے انسان کبھی بھی قرآن کی ہدایت پر نہیں آ سکتے۔ چاہے وہ قرآن کو دِن رات پڑھتے ہوں اور اسپر لیکچر بھی دیتے ہوں۔ یتیم اور مسکین مکافات عمل کے ساتھ قرآن کا بنیادی پیغام ہے اور یہاں سے اس کا سفر اعلیٰ مقصد کی طرف شروع ہوتا ہے۔ اس لئے ایمان اور اعمال صالحہ کو قرآن نے اپنے فارمولے کا نقطہء ماسکہ بتایا ہے اور اس کے اوپر انسان کی نئی زندگی حاصل کرنے کا دارومدار ہے۔ اگر ہم اس طرح قرآن پر غور کریں تو پھر شروع سے آخر تک قرآن خود اپنے آپ کو ہم پر ظاہر کرتا چلا جاتا ہے۔ اور دین کا نظام سمجھ میں آنا شروع ہو جاتا ہے۔

مثلاً آیات دیکھئے (107:1-3) (93:7-11) (89:10:17) (2:219) (70:22-26)

34- ربوبیت

ویسے تو ربوبیت پورے قرآن کو حاوی ہے اور جہاں بھی اللہ کی صف بحیثیت رب آئی ہے وہاں ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کا تعلق نظام ربوبیت کے ساتھ کیا ہے۔ ربوبیت میں دوسروں کی پرورش کرنے کے تمام پہلو آ جاتے ہیں۔ اس نظام کے سمجھنے اور اس کے لئے کام کرنے سے ہماری ذات مستحکم ہو جاتی ہے بلکہ مستحکم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ انفاق سے ان کا اثبات نفس ہوتا ہے (2:267) اگر دنیا میں ربوبیت کا نظام دین کا حصہ نہیں ہوگا تو انسان فساد اور خون خرابہ کرے گا۔ ربوبیت کا تعلق فرد اور قوم دونوں کے ساتھ ہے۔ اسی کے سمجھنے سے انسان کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھ آتا ہے اور صراطِ مستقیم کی اہمیت سامنے آتی ہے۔

35- انسانوں کی دنیا میں حرکت پر پابندی نہیں لگ سکتی

قرآن نے عام انسانوں اور مومنین سب سے کہا ہے کہ اللہ کی زمین سب کے لئے ہے اور وہ جہاں چاہے جا کر بس سکتے ہیں۔ ساتھ ہی مومنین سے کہا ہے کہ اگر ایک خطہء زمین میں حالات سازگار نہیں تو کسی اور حصہ میں چلے جاؤ جہاں اللہ کا نظام قائم ہو سکے۔ (29:56) تاریخی حالات معلوم کرنے کے سلسلہ میں بھی زمین میں گھومنے پھرنے کا ذکر ہے۔ اِس لئے اس

مستقل قدر کے نیچے کسی انسان اور پارٹی کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی زمین پر لکیریں لگا کر انسانوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے سے روک سکے۔ اس کے ساتھ یہ شہریت وغیرہ کا تصور بھی شیطانی نظام کی پیداوار ہے۔ ہر انسان اللہ کی زمین کا شہری ہے اور یہ زمین آدم کو مدت معینہ کے لئے ملی ہے۔ یعنی پیدائش سے موت تک اور زندگی چونکہ ایک سفر ہے اس لئے کہہ دیا کہ یہ متاع حیات الدنیا ہے۔ (3:14)

36- قرآن خود بھی مستقل قدر ہے

قرآن خود ایک مستقل قدر ہے کیونکہ اس میں انسانیت کو بتا دیا گیا ہے کہ جب نظام اس کی اقدار کے خلاف ہوگا تو دنیا 2024ء جیسی ہوگی۔ اگر طاغوتی دنیا نہیں چاہتے اور اللہ (کے قانون) کی مدد سے دین کا نظام بنانا چاہتے ہو تو قانون کے فارمولا پر چلو اور دیکھو کیسے نتائج وہ نکلیں گے جو کہ اس فارمولا میں دئے ہوئے ہیں۔ یہ ایک مکمل کتاب ہے اور اس کی یہ خوبی ہم نے خود کو تبدیل کر کے اس کو ایمان کا حصہ بنانا ہوتا ہے۔ انسانی عقل خود اس طرح نہیں سوچ سکتی۔ اسی لئے بغیر قرآن کی ہدایت ہمارے اختلافات کبھی بھی ختم نہیں ہو سکتے۔ دین کے قیام کے سلسلہ میں اللہ کے قانون کی صرف اُس وقت مدد مل سکتی ہے جب ہم اس کتابِ عظیم پر اس طرح عمل کریں جس طرح اِس نے خود تفصیل سے بتایا ہے۔ ادارہ طلوع اسلام اس سلسلہ میں خوشی سے مدد مہیا کرتا ہے۔ اگر دین کا نظام چاہتے ہیں تو یہ واحد ادارہ جس کا ممبر بن کر ہم اس نظام کے قیام کی کوشش کر سکتے ہیں۔

37- الاسماء الحسنیٰ۔ (اللہ کی صفات)

مستقل اقدار کا سرچشمہ خود اللہ کی ذات ہے۔ قرآن نے جن صفات کا ذکر کیا ہے وہ سب بھی مستقل اقدار کے زمرہ میں آتی ہیں۔ ان صفات کو سامنے رکھ کر اپنے اندر انسانی ممکنات کو مشہود کئے جانا مقصدِ دین اور مطلوب حیات ہے۔ یہاں ہمیں مستقل اقدار اور اللہ کی صفات کا باہمی تعلق ذہن میں رکھنا چاہئے۔ مستقل اقدار دین کے نظام کی حدود متعین کرتی ہیں یعنی دین کے نظام کا جو دستور ہوگا جو کہ غیر متبدل ہوگا اس میں ساری مستقل اقدار آئیں گی اور قرآن بھی ان میں شامل ہوگا تا کہ کچھ باہر نہ رہ جائے۔ قدرتی بات ہے کہ دین کا نظام آہستہ آہستہ، مرحلہ بہ مرحلہ تکمیل تک پہنچے گا۔ مسلسل اقدار کے نیچے جو جزئیات مرتب ہوں گی باہمی مشورہ سے وہ دستور کے ساتھ ضمیمہ کے طور پر منسلک ہوں گی لیکن دستور علیحدہ رکھا جائے گا۔ کیونکہ ضمیمہ میں ترامیم باہمی مشاورت سے ہو سکتی ہیں لیکن دستور غیر متبدل ہوگا سوائے اس صورت میں کہ اِس میں کسی مستقل قدر میں کوئی غلطی ملی ہے اور اسے درست کرنا ضروری ہے۔

اللہ کی صفات چونکہ افراد کی ذات کے ساتھ متعلق ہیں سوائے ان کے جو مستقل اقدار کے ساتھ بھی متعلق ہیں۔ اس لئے یہ تعلیم و تربیت کا حصہ ہوں گی۔ مومنین دین کے نظام کو بنانے میں اِن سے مدد لیں گے تا کہ ان کی ذات اُس مقام پر پہنچ جائے جہاں ان کو دین کے نظام کی نہ صرف سمجھ آ جائے بلکہ وہ اِن صفات کو اپنی ذات سے باہر کی دنیا میں ظاہر ہونے کا تجربہ کریں۔ ساتھ ہی وہ ان کا اپنے ساتھیوں میں بھی مشاہدہ کر سکیں۔ جب دین کا نظام شروع ہو جائے تو یہ صفات ایک باقاعدہ کورس کے تعلیم و تربیت کا حصہ بنیں گی۔

مردِ مومن اس کو کہتے ہیں جس سے ان صفات کا ظہور از خود ہوتا جائے۔ یہی وہ افراد ہیں جن سے قرآنی معاشرہ متشکل ہوتا ہے۔ اگر عالمِ انسانیت میں اس قسم کا معاشرہ قائم ہو جائے جس میں مستقل اقدار کا احترام دِل کی گہرائیوں سے اُبھرے اور انہیں کسی صورت میں بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے تو یہ دنیا کس طرح جنت میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس جنت میں ہر فرد کو اس امر کی ضمانت حاصل ہوگی کہ اس کے ساتھ مستقل اقدار سے ہٹ کر کچھ نہیں کیا جائے گا۔ مومن کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ جو امن میں ہو اور دوسروں کو امن کی ضمانت دے۔ دنیائے انسانیت میں حقیقی امن صرف جماعت مومنین کے ہاتھوں قائم ہو سکتا ہے۔

انسانی نظام کی اقدار (2024)

1- جس کی لاٹھی اس کی بھینس (Might is right)

2- پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو (Divide & rule)

3- اکثریت کا فیصلہ 'برحق' ہے (Majority is authority)

4- ہر قوم کو چاہئے کہ اپنا فائدہ مدِ نظر رکھے۔

5- دوسروں کی مدد سے اگر کوئی فائدہ نہیں تو مدد کی ضرورت نہیں

6- اپنی قوم کے مفاد کے لئے اگر جھوٹ بولنا پڑے تو جائز ہے۔

7- سیکورٹی کونسل میں 5 طاقتور ممبران کسی بھی قرارداد کو ویٹو (Veto) کر سکتے ہیں اگر وہ ان کے فائدہ میں نہیں ہے۔

8- طاقتور ملکوں کے فوجیوں کو جنگ کے جرائم پر مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔

9- ڈپلومیسی کا مقصد ہے کہ اپنی قوم کے لئے فوائد حاصل کرنا چاہے اس سے دوسروں کا جانی اور مالی نقصان ہو۔

10- سرمایہ دارانہ نظام میں معاوضہ سرمایہ کا ہوگا محنت کا نہیں۔

11- کوئی انسان ایک ملک سے دوسرے ملک نہیں جا سکتا جب تک اس کے پاس پاسپورٹ اور ویزا نہ ہو اور وہ دوسرے ملک کی شرائط کو پورا نہ کر رہا ہو۔ غریب آدمی کبھی بھی ایک ملک سے دوسرے ملک نہیں جا سکتا۔

12- ہر قوم کا اپنا نظام عدل ہے۔ اس لئے جب ایک فانی انسان مختلف ملکوں میں سفر کرتا ہے تو وہ مختلف ملکوں کے نظام عدل کے تحت آتا ہے۔ اسی طرح ایک ہی ملک کے اندر مختلف نظام عدل ہوتے ہیں۔

13- یہ حال نظامِ تعلیم اور صحت کا ہے۔

14- عام انسان اللہ کی زمین کا شہری نہیں بلکہ کسی نہ کسی ملک کا شہری ہے۔ اگر غریب ملک کا شہری ہے تو اُس کو وہ مراعات حاصل نہیں ہوتیں جو کہ امیر ملک کے شہری کے پاس ہوتی ہیں۔

15- اِس وقت دنیا کے کسی بھی ملک میں دین کا نظام یعنی مستقل اقدار کی حکومت نہیں (اللہ کہیں بھی اقتدارِ اعلیٰ میں نہیں ہے)

16- انسان اختلافات میں بٹے ہوئے ہیں اور پیارٹیان بنانا اور اختلافِ رائے کرنا نہ صرف جائز سمجھا جاتا ہے بلکہ (Promote) کیا جاتا ہے۔ اختلاف رائے کو جہاں (suit) کرے پروموٹ کیا جاتا ہے۔

17- LGBTQ کی لہر آئی ہوئی ہے۔

18- کاروبار میں جتنا مرضی منافع لیا جاسکتا ہے اور اس ہیرا پھیری کی اجازت ہے۔ مثلاً ایک دن آپ ایک چیز پوری قیمت پر خریدتے ہیں، اگلے دن وہ سیل پر لگ جاتی ہے۔

19- کرنسی ریٹ ہر روز نئے ہوتے ہیں۔ ہر چیز عارضی ہے کوئی بھی قانون مستقل نہیں ہوتا۔ قوانین کی تبدیلی عام ہے۔

20- ٹیکس بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ افراطِ زر بھی ٹیکس میں آتا ہے۔

21- زندگی موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ اور اگر پکڑے نہ جاؤ (انسانی قوانین کے نیچے) تو کوئی بھی جرم کیا جاسکتا ہے۔ بعض ملکوں میں امیر اور طاقتور کوئی بھی جرم کرسکتا ہے۔ کوئی حساب کتاب ممکن نہیں ہے۔

22- طاقتور ملک اپنے مفاد کے لئے کسی بھی ملک پر حملہ کرسکتا ہے اور وہاں جا کر قبضہ کر کے رہ سکتا ہے۔ UNO برائے نام ادارہ ہے۔ انسانی حقوق کی بات زبانی جمع خرچ تک محدود ہے۔

23- میڈیا سے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ دکھایا جاسکتا ہے۔ اکثریت عام آدمی کو دنیا کے حالات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

24- اکثریت مسلمانوں کی قرآن کو ثواب یا ذہنی علاج کے لئے پڑھتے ہیں۔ سوائے طلوع اسلام کے کوئی بھی دین اسلام میں دلچسپی نہیں رکھتا۔

25- قول اور فعل میں تضاد کو قبول کیا جاتا ہے۔

26- معاہدات کو آسانی سے توڑا جاسکتا ہے۔ جو بھی طاقتور ہے اس کے لئے معاہدہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اپنے فائدہ کے لئے اس کو توڑا جاسکتا ہے۔

27- سارے ملکوں میں انسان کی بحیثیت انسان کے کوئی قدر نہیں ہے۔ آپ کو (Commodity) سمجھا جاتا ہے جہاں (Welfare) نظام ہے وہاں اکثریت کو خاموش رکھنے کے لئے مدد کی جاتی ہے۔ بحیثیت انسان ان کو وہ قدر حاصل نہیں ہے جو کہ قرآن نے بتائی ہے۔ جو کہ ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔

28- اسلامی جمہوریہ ایک متضاد اضافی قدر ہے۔ قرآن کے اسلام میں عوام کی خواہش شامل نہیں ہوسکتی۔

29- قرآن اور سنت ایک شرکیہ قدر ہے۔

30- زمین کی اہمیت انسانی جان سے زیادہ ہے۔ اس لئے زمین اور اسکے ذرائع پر قبضہ کرنے کے لئے انسانوں کو بے گھر اور قتل کیا جاسکتا ہے۔

31- شادی مادی مفاد کے لئے کی جانی چاہیے۔ (ایمان کا کوئی تعلق نہیں)

32- عورت مرد بن سکتی ہے۔ مرد عورت بن سکتا ہے۔ 33- پارٹی کا مفاد سامنے رکھنا چاہئے۔

34- غیر انسانی سلوک جائز ہے، اگر اس سے ملک کو فائدہ ہے۔ کسی کو بھی بغیر مقدمہ اور انصاف کے قیدی بنایا جاسکتا ہے۔

محمد عامر، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعمیرِ بیابانِ دگر

محترم حاضرینِ کرام، قابلِ قدر چیئرمین، ادارہ طلوعِ اسلام اور ذی وقار صدرِ محفل

السلام علیکم!

موجودہ حالات کے تناظر میں قرآنی رہنمائی کے موضوع پر ادارہ طلوعِ اسلام کی جانب سے مجھے اظہارِ خیال کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ موضوع انتہائی اہم اور بروقت ہے۔ غالب کے نزدیک تو شب و روز ایک تماشہ اور دنیا ایک بازیچۂ اطفال سے زیادہ کچھ حیثیت نہ رکھتی تھی، لیکن کسے خبر تھی کہ طاقت کی ہوس اور وسائلِ کائنات پر غاصبانہ قبضے کی خواہش اقوامِ عالم کی مخاصمت کو غالب کے اس ایک شعر کی جیتی جاگتی تصویر بنا دے گی۔

ختمِ نبوت سے پیشتر دستورِ خداوندی یہ رہا کرتا تھا کہ انسانوں کی ہدایت کے لئے جب اور جہاں ضرورت پڑتی ایک پیغام بر کو مبعوث کر دیا جاتا۔ اس پیغام بر کی ذمہ داری نہ صرف خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچانا ہوتا تھا بلکہ اس پیغام کی بنیاد پر ایک نظامِ معاشرہ ترتیب دینا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔ یہ رسول خدا کی طرف سے عطا کردہ انقلابی پیغام لے کر اٹھتا اور معاشرے میں موجود ناہمواریوں کے خلاف ایک علمِ احتجاج بلند کرتا ہوا غیر منصفانہ نظام کے خاتمے کے لئے پیہم مصروفِ عمل رہتا۔ آخر کار ایک نظام کا خاکہ تشکیل دے کر اسے اپنی قوم کے سپرد کر کے اپنا فریضۂ رسالت ادا کرنے کے بعد اگلی منزلِ حیات کی طرف رواں دواں ہو جاتا۔ یہ قوم کچھ عرصے اس نظام کی پاسداری کرتی اور پھر حرص و ہوس سے مغلوب ہو کر اس نظام کو اپنی مفاد پرستیوں کی نظر کر دیتی۔ پھر اس پیغام کی تجدید کے لئے ایک اور پیغام بر کی ضرورت پیش آتی اور خدا اس جنت سے نکالے ہوئے آدم سے کیا گیا اپنا وعدہ پورا کرتا اور اس کی رہنمائی کے لئے ایک اور نبی و رسول کی بعثت ہوتی۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا گیا تا آنکہ ذہنِ انسانی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اس سطح پر پہنچ گیا جہاں اس سلسلۂ نبوت و رسالت کی آخری کڑی کی بعثت ہوئی۔

ختمِ نبوت کہنے کو تو ایک اختتام تھا لیکن اس ایک اختتام میں ہزار ہا آغاز پوشیدہ تھے۔ انسانیت اپنے عہدِ طفولیت سے عہدِ شباب میں قدم رکھ رہی تھی اور اس کی خودداری اس بات کی متقاضی تھی کے اس کے ساتھ سلوک بھی جوانوں والا کیا جائے۔ ہدایت اور رہنمائی کو ایک آخری بار اس کے سامنے رکھ دیا جائے اور اس کی صلاحیتوں پر اعتماد کیا جائے کہ یہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس رہنمائی کے ذریعے اپنے لئے ایک ایسے نظام کی بنیاد ڈال لے گا کہ جس کے ذریعے اپنی فردوسِ گم گشتہ کو

پھر سے پالے گا۔ ختمِ نبوت دراصل خودیٔ مطلق کی جانب سے آدم کو اس بات کا اشارہ تھا کہ بس عشق کی ایک جست اور یہ زمین و آسمانِ بے کراں تیرے تہِ پا ہوں گے۔ یہ مہر و ماہ و مشتری تیرے ہم عناں نہیں تو نے تو ان پر کمندیں ڈالنی ہیں اور ان کی حیثیت تیری گردِ راہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور بس اتنا ہی نہیں اسے تمام کائناتی قوتوں کو دیے گئے اذنِ ایزدی کی یاددہانی بھی کرائی اور بتایا کیسے یہ سب اس کے تابعِ فرمان بنا دیے گئے ہیں۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا (2:34)

لیکن اس کے ساتھ اسے یہ بھی باور کروا دیا کہ اختیار و ارادہ کی جو صلاحیت تمہیں دی گئی ہے اس کا صحیح استعمال نہایت ضروری ہے۔ خدا کی طرف سے اس اختیار و ارادہ پر کوئی قدغن نہیں لگائی گئی لیکن یہی اختیار و ارادہ تمہاری اس صلاحیت کو غرور میں تبدیل کر کے خود تمہارے خلاف استعمال کرے گا اور تمہاری باقی صلاحیتوں کو ڈھانپ لے گا اور تمہیں مایوسیوں کے جہنم میں دھکیل دے گا۔

اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۴ (2:34)

تاریخِ انسانیت میں ختمِ نبوت ہی وہ مقام ہے جہاں ابلیسیت کو اس بات کا احساس ہوا کہ آخری پیغام کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے رکھی ہے، تو اس پیغام کو تو تبدیل نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اس نے دو رویہ چال چلی۔ ایک طرف تو اس نے خدا کے پیش کردہ دین کو مذہب کی شکل دے کر انسانیت کو انہی شکنجوں میں جکڑ دیا جن سے آزاد کرنے کے لئے خدا کی طرف سے یہ دین آیا تھا۔ دوسری طرف اس نے اس مسخ شدہ مذہب کے متعلق کہا کہ یہ تو انسانیت کے لئے ایک افیون ہے۔ تمہیں زندگی گزارنے کے لئے کسی خارجی مدد کی ضرورت نہیں، تمہاری عقل خود مکتفی ہے اور تمہارے لئے ایک نظامِ زندگی تراش سکتی ہے، بلکہ ایک کیا تم اس قابل ہو کہ اپنے لئے کئی نظامِ زندگی تراش سکو۔

لگتا یوں ہے کہ آخری ہدایت دینے کے بعد خدا نے جب انسان سے کہا تھا کہ اگر تمہیں اس میں کوئی شک ہے، کوئی ریب ہے کہ یہ نظام وہ نتائج پیدا نہیں کرے گا جس کا وعدہ کیا گیا ہے، تو جس چیز کو خدا نے ایک تحدی کے طور پر انسان کے سامنے رکھا تھا کہ اس پورے نظام کو تو ایک طرف رکھو اس کی کسی ایک شق جیسی کوئی شق بنا لاؤ تو انسان نے بجائے اس تجویز کردہ نظام کو اپنانے کے اس تحدی کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۲۳ (2:23)

جیسے انگریزی میں کہتے ہیں They decided to take the scenic route لیکن تاریخ گواہ ہے کہ اس شوقِ نظارہ نے انسانیت کو صرف اور صرف اس جہنم کی ہی ایک جھلک دکھائی ہے جس میں انسانیت نے خود اپنے آپ کو قربان کیا ہے، اور اس میں کسی عام و خاص کی تخصیص نہیں۔ حالانکہ تحدی دینے والے نے پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا کہ اس کا انجام

بالآخر یہی ہوگا۔

فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۖ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِیۡنَ ﴿۲۴﴾

(2:24)

انسانی نظامہائے حیات پر ایک نظر:

اس مقام تک پہنچنے کے بعد بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس النّار کی شکل بھی دیکھ لیں جس کا ایندھن، قرآن کے مطابق، ہر خاص و عام ہوتا ہے اور جو بھڑکائی جاتی ہے ان کے لئے جو اپنی انسانی صلاحیتوں کے استعمال سے یا تو گریز کرتے ہیں اور یا پھر انہیں پیش پا افتادہ مفادات کے حصول کے لئے استعمال کر کے، ان صلاحیتوں کے مضرت رساں نتائج کے ذریعے، ان کے اندر موجود ممکنات کو ڈھانپ دیتے ہیں۔

کسی بھی نظام کے لئے تین اجزاء کلیدی حیثیت رکھتے ہیں، سماجی، سیاسی اور معاشی۔ یہ تینوں اجزاء ایسے باہم جڑے ہوئے ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود بھی ناممکن ہے۔ ایک ایسا سماج یا معاشرہ جس کے انتظام کے لئے کوئی سیاسی نظام موجود نہ ہو اور اس معاشرے کی معیشت کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو قائم نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح ایک سیاسی نظام جس کے قیام کے لئے کوئی معاشرہ موجود نہ ہو محض خیال ہے۔ اور یہی بات معاشی نظام کے بارے میں بھی صادق آتی ہے۔

معاشرتی پہلو:

کسی بھی تہذیب یافتہ معاشرے کے تمدن اور بود و باش کے لئے اقدار کی ضرورت ہوتی ہے جن کے ذریعے وہ معاشرہ آگے بڑھتا ہے۔ انسانوں کے خود ساختہ نظامہائے حیات میں اقدار کی حیثیت اضافی یعنی (Relative) ہوتی ہے، یعنی جو اقدار ایک انسانی معاشرے کے لئے بنائی جائیں ان کا اطلاق کسی دوسرے انسانی معاشرے پر نہیں ہوتا۔ یہ صورتِ حال مختلف زمانوں میں رہنے والے انسانوں کے لئے ہی نہیں، ایک ہی زمانے میں دو مختلف معاشروں میں اقدار کا فرق ہو سکتا ہے۔ اور یہ فرق ایسا ہے کہ دو انسانی معاشروں میں ایک ہی قدر متضاد حیثیت رکھ سکتی ہے۔ مثلاً ایک ہی وقت میں ایک گروہِ معاشرہ شراب نوشی کی حرمت کا قائل ہے جب کے دوسرے گروہ کے لئے یہ تفننِ طبع کا ایک ذریعہ ہے اور ان کے نزدیک اس پر حرمت کا فتویٰ لگانا انسان کی آزادی سلب کرنے کے مترادف ہے۔

سعیٔ انسانی کی تازہ ترین شکل وطن کی بنیاد پر ایک قوم کی تشکیل ہے۔ اس بنیاد سے انسانوں نے قومی ریاست (Nation-state) کا تصور وضع کیا۔ ہمارے نزدیک یہ ابلیسیت کے غرور اور گھمنڈ کی ایک شکست ہے۔ اس نظریے کے ذریعے انسان نے اپنی تقسیم کا ایک اور طریق تلاش کیا ہے، نہ جانے انسان کی خود اپنی انسانیت کو تقسیم کرنے میں کیا کشش ہے کہ اس نے جب بھی کوشش کی ہے اس کا مدار یہی تقسیم رہی ہے۔ شاید اس تقسیم کے پیچھے یہ سوچ کارفرما ہو کہ تمام انسانیت کے لیے نظام بنانا ممکن نہیں، تو ہم اس مسئلے کو فتح بذریعہ تقسیم (Divide and conquer) کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی

لیے ہم نے اس کوشش کو شکست سے تعبیر کیا ہے۔ اقبال تو ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور تہذیبِ جدید کے آذر کے تراشے گئے اس تازہ صنم وطنیت کو شرک قرار دیتا ہے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

اقبال کے نزدیک وطن کی اصطلاحِ جدیدالہٰ کے مترادف ہے۔ اوطان سے متعلق مولانا حسین احمد مدنی کے بیان کے جواب میں اقبال نے اپنی نظم میں انہیں رمزِ دین سے نا آشنا قرار دیا ہے۔

بحر حال ہم بات کر رہے تھے معاشرے کے قیام اور بقا کے لئے اقدار کی ضرورت اور اہمیت پر اور کیسے انسان نے ایک قومی ریاست کی تقسیم کے ذریعے سے مختلف معاشرے بنا کر ان اضافی اقدار کا ایک تجربہ کرنے کی کوشش کی جو تا حال جاری ہے۔ جاری تو اسے وقت کے جبر نے رکھا ہوا ہے کیونکہ وقت کو روکا نہیں جا سکتا، ورنہ اس کے ہولناک نتائج جسے انسانیت کی اکثریت آج بھگت رہی ہے وہ کسی کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ غالب اور مغلوب قوموں کی موجودگی اس نظام کی ناکامی کا ہی ایک مظہر ہے۔ ہر غالب قوم اپنی مغلوب قوموں کو اپنے سے کم تر گردانتی ہے اور یہ فوقیت کبھی نسلی تفاخر کی شکل میں سامنے آتی ہے اور کبھی لسان و رنگ کی شکل میں۔ اور پھر جو سلوک مغلوب قوموں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے اس کے لئے کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

معاشرتی زندگی کا ایک اور پہلو مقصدِ حیات سے متعلق ہے یعنی معاشرے کے قیام کا وجہ جواز کیا ہے اور ہر فردِ معاشرہ کس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ انسان نے مجبوراً جو وجہ جواز اپنے لئے گھڑے ان میں سے دو قابل ذکر ہیں۔ جمہوری نظام میں حصولِ خوشی (Pursuit of happiness) اور اشتراکی نظام میں خدا سے نجات حاصل کر کے مکمل آزادی۔

مکمل آزادی کے خواب کا تو، پچھلی صدی کی آخری دہائی سے پہلے کے، روسی معاشرے کا ایک نقشہ اور جبر کے ذریعے سے آزادی حاصل کرنے کا ایک بھیانک تجربہ ابھی کل ہی کی بات ہے۔ رہی بات حصولِ خوشی کے مقصدِ حیات کی تو ان بنیادوں پر قائم معاشرہ ابھی رنگ و نسل کے امتیاز سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اور پھر بذاتِ خود یہ لفظ خوشی (Happiness) ابھی تک تشنۂ تشریح ہے۔ تحقیق جاری ہے کہ خوشی (Happiness) کیا ہے اور کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔ یعنی مقصد تو بنا لیا لیکن آج تک یہ واضح نہیں ہو سکا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

ماضی قریب میں خوشی کو ماپنے کے لئے چند پیمانے وضع کیے گئے جن کی بنیاد پر ریاستوں میں بسنے والے افراد کی خوشی کی درجہ بندی کی جاتی ہے۔ لیکن یہ پیمانے ویسے ہی اضافی ہیں جیسے ان نظام ہائے حیات میں موجود اقدار۔ آج کے پیمانوں کا اطلاق کل کے حالات پر نہیں ہوگا۔ جیسے جیسے حالات تبدیل ہوں گے یہ پیمانے بھی تبدیل ہوتے رہیں گے۔

سیاسی پہلو

کسی بھی سیاسی نظام کے لئے سب سے بنیادی چیز یہ ہے کہ حقِ حکومت کسے حاصل ہے۔ جمہوری نظامِ سیاست میں یہ حق جمہور کو دیا گیا ہے جس کی عملی شکل اکثریت کی حکومت ہے۔ دوسرے معنوں میں عوام کی اکاون فی صد آبادی جس امر کے متعلق یہ فیصلہ صادر کر دے کہ یہ اُن کے نزدیک صحیح ہے اس صحیح تسلیم کیا جائے گا اور باقی ماندہ انچاس فی صد آبادی کو طوعاً یا کرہاً اسے ماننا پڑے گا۔ اضافی اقدار کے ساتھ ساتھ قوانین بھی اضافی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طریقِ کار کے لئے پھر مختلف سیاسی جماعتوں کا قیام عمل میں آتا ہے اور ہر سیاسی جماعت اپنی مرضی کو مسلط کرنے کے لئے عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کی غرض سے ہر حربہ آزماتی ہے۔ ہم نے یہاں مرضی کو مسلط کرنے کے الفاظ دانستًا استعمال کئے ہیں کیونکہ اخلاقیات کا کوئی خارجی معیار نہ ہونے کا منطقی نتیجہ ہر شخص یا گروہ کی اپنی اپنی اخلاقی اقدار کا ہونا ہے۔ اور یہ اخلاقی اقدار ذاتی اور عوامی زندگی کے لئے مختلف ہونا کوئی ایسی اچنبھے کی بات بھی نہیں۔ جب مقصد پیشِ نظر حصولِ اقتدار ہو تو اس کے لئے اگر اخلاقی اقدار پر کچھ سمجھوتہ بھی کرنا پڑے تو کوئی حرج نہیں۔ یہ سوچ ہماری اپنی نہیں ماہرینِ سیاسیات کے نزدیک یہ کوئی راز کی بات نہیں۔ مثال کے طور پر جوڈ کے ان الفاظ کو لیجیے۔

If we were to behave in our private lives as we are obliged to behave life, we should be regarded as moral lepers."

اگر ہم اپنی ذاتی زندگیوں میں ویسا برتاؤ رکھیں جیسا ہمیں اپنی عوامی زندگی میں اختیار کرنا پڑتا ہے تو ہم اخلاقی کوڑھی متصور ہوں گے۔ اور یا پھر Camillo di Cavour کے یہ الفاظ

"If we did for ourselves what we do for our country, what rascals we would be."

اگر ہم اپنی ذات کے لئے وہی کچھ کریں جو ہم اپنے وطن کے لئے کرتے ہیں، تو کیسے بدطینت اور شیطان کہلائیں۔

ذاتی اور عوامی زندگی میں اخلاقی معیار کی یہی ثنویت تھی جس کے ذریعے ایک دور میں برطانیہ نے دنیا کے وسائل پر قبضہ کیا اور انہیں بے دریغ لوٹا۔ اور آج امریکہ اسی ثنویت کو اپنا کر باقی دنیا کو اپنے سے کم تر خیال کرتا ہے اور ان کے وسائل پر قبضے کے لئے ان ممالک پر جنگیں مسلط کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

عقل کے خود مکتفی ہونے اور کسی خارجی معیار کو نہ ماننے کے بعد جس قسم کے عذاب سے دنیا اس وقت گزر رہی ہے، اقبال کی دور بیں نظروں نے بیسویں صدی کے اوائل میں ہی اس کا ادراک کر لیا تھا۔

وہ حکمت ناز تھا جس پر خرد مندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

انسانیت دو عظیم جنگوں کو آج تک بھگت چکی ہے۔ اور آج کے حالات کے متعلق بعض ماہرین کا خیال ہے کہ شاید تیسری جنگِ عظیم کا آغاز ہو چکا ہے لیکن ابھی ہمیں اس کا ادراک نہیں۔ ہم تیسری جنگِ عظیم میں رہ رہے ہوں یا نہیں لیکن یہ بات کہ امریکہ اور چین کے درمیان طاقت کی رسہ کشی انسانیت کے لئے جو مسائل پیدا کر رہی ہے ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں۔

بحر حال، عقل کے تجرباتی طریق نے جو ترکیب انسان کو سجھائی اس کا نتیجہ انسان کی انسان پر حکومت ہے۔ انسانوں کی اکثریت کے بنائے ہوئے قوانین ہر فردِ معاشرہ کو تسلیم کرنے پڑتے ہیں، چاہے وہ ان سے متفق ہو یا نہیں۔ اور پھر یہی حالت اقوام کے مابین بھی ہے۔ طاقت کی بنیاد پر دوسرے انسانوں پر حکومت، چاہے اس کے لئے جبر و تعدی، جھوٹ اور دھوکہ دہی سے کام لینا پڑے۔ اور یہی چیز اس تمام افراتفری اور جنگ و جدل کی جڑ بنیاد ہے۔

تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

معاشی پہلو

دورِ حاضر میں معیشت کے انتظام کے لئے سرمایہ دارانہ نظام رائج ہے۔ جس کے ماتحت ہر شخص کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لئے جس قدر دولت اکٹھی کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ یہاں جس قدر کے الفاظ نہایت اہم ہیں۔ معاشی ماہرین بخوبی جانتے ہیں کہ ایک وقت میں دولت کی مقدار محدود ہوتی ہے۔ اپنے لئے جس قدر چاہے دولت اکٹھی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ موجود ذخائرِ دولت سے زیادہ سے زیادہ اپنے لئے سمیٹ لینا، اس کا لامحالہ نتیجہ یہ ہوگا کہ باقی افراد کے پاس اس دولت کی تقسیم میں کمی واقع ہو جائے گی۔ اس سے مفادات کا ٹکراؤ جنم لیتا ہے۔ اور مفادات کا یہی ٹکراؤ اس سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہے۔ اور ہوس اس نظام کی بنیاد۔ کسی بھی انسان کو ایک باعزت زندگی گزارنے کے لئے محدود وسائل کی ضرورت پڑتی ہے، لیکن انسان کی ہوس کبھی مطمئن نہیں ہوتی، مزید سے مزید چاہتی ہے۔ اس ننانوے کے پھیر میں پڑنے والے کے لئے دنیا کی ساری دولت بھی کم پڑ جاتی ہے۔

اس مزید سے مزید کی خواہش سے جنم لینے والے مسائل کے لئے پھر قوانین بنائے جاتے ہیں کہ کوئی شخص اجارہ داری حاصل نہ کر سکے۔ لیکن سیاسی پہلو کے ضمن میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ سیاسی اخلاقیات اضافی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر کسی شخص نے زیادہ سے زیادہ وسائل کو اپنے لئے سمیٹ لیا ہے، تو وہ سیاسی قوانین پر اثر انداز ہو کر ان قوانین کا رخ با آسانی اپنی طرف موڑ سکتا ہے۔ اس بات کا مشاہدہ روز مرّہ کی زندگی میں ہم کثرت سے کرتے ہیں۔ اور پھر اجارہ داری کے ان قوانین سے بچنے کی گریز کی راہیں بھی یہی سیاسی ماہرین ان سرمایہ داروں کو سجھاتے ہیں۔ اس سرمایہ دارانہ نظام ہی کی برکت ہے کہ آج دنیا کی ایک فی صد آبادی دنیا کی پچاس فی صد سے زائد دولت کی مالک ہے، جبکہ انسانیت کے ایک بہت بڑا طبقے کو دو وقت کی روٹی

تک میسر نہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کے بنانے والوں کے نزدیک مقصد انسانیت کے معاشی مسائل حل کرنا تھا۔لیکن اس کے ذریعے انسانیت کی ایک بہت چھوٹی آبادی ہی اس سے فائدہ اٹھا سکی ہے، باقی ماندہ کو اپنی روٹی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ وجہ اس کی وہی کہ اس کی بنیاد میں ہی ایک خرابی تھی، اور وہ تھی ہوس اور لالچ کی ترغیب۔جس نظام نے انسانیت کے معاشی مسائل حل کرنے تھے اس کی بنیاد نے اسے ایسے طریق سکھائے کہ انسانیت کی اکثریت اپنی بنیادی ضروریات کے لئے بھی ترس رہی ہے۔نظامِ سرمایہ داری کے متعلق یہی چیز تھی جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا تھا۔

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

انہی سرمایہ دارانہ نظام کے حامل ممالک میں بعض سیاست دانوں نے سوشلسٹ نظام کی طرز پر افرادِ معاشرہ کے لئے نظامِ حکومت میں اصلاحات کی تبلیغ بھی شروع کر دی ہے۔ان کے نزدیک ان اصلاحات کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام کے پیدا کردہ ان مسائل کا حل کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ایک انسانی نظام سے دوسرے انسانی نظام کی طرف سفر ہوگا، جس کے نقصان دہ نتائج کے لئے نہ جانے اور کتنی نسلوں کو انتظار کرنا پڑے گا۔

یہ تھا ایک نہایت مختصر سا تعارف سماجی، سیاسی اور معاشی پہلوؤں کے چند گوشوں کا۔اگر آپ احباب ان موضوعات میں دلچسپی رکھتے ہیں تو علامہ پرویز صاحب کی کتاب انسان نے کیا سوچا بڑی تفصیل سے ان موضوعات پر بحث کرتی ہے۔

پس چہ باید کرد

عقل کے تجرباتی طریق نے ہمیشہ انسانیت کو مایوس کیا ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے علاوہ بھی انسانیت کے پاس کوئی راستہ ہے۔

وہی دیرینہ بیماری وہی نا محکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

یہ آبِ نشاط انگیز موجود تو ابتدائے انسانیت سے رہا لیکن ختم نبوت کے بعد اپنی آخری شکل میں قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔اور یہی وہ بیابانِ دگر ہے جس کی تعمیر کی ذمہ داری ہر وہ شخص اٹھاتا ہے جو اس پر ایمان رکھنے کا دعوے دار ہے۔اس بیابانِ دگر کی تفصیل تو پورے قرآن میں موجود ہے، ہم یہاں اس کا ایک مختصر سا نقشہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن انسانوں کے بنائے ہوئے معاشرتی نظام کے علی الرغم، جس میں اقدار اضافی حیثیت رکھتی ہیں، مستقل اقدار فراہم کرتا ہے۔انسانی معاشرے کے لئے سب سے بنیادی مستقل قدر تکریم انسانیت ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70)

اورانسانیت کی یہ تکریم محض انسان ہونے کی جہت سے ہے، ہرانسانی بچے کو پیدائش کے ساتھ تکریم کا حق حاصل ہے۔ یہ حق ہروقت اور ہرزمانے میں ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے، نہ اکثریت کی خواہش پر اسے تبدیل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس میں رنگ ونسل کی کوئی تخصیص پیدا کی جاسکتی ہے۔ قرآنی رہنمائی کی بنیاد پر قائم کردہ معاشرے میں افراد کی کیفیت، اس قرآن کے لانے والے نبی اوراس کے رفقاء کے تتبع میں، یہ ہوتی ہے۔

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29)

یہ ان تمام عناصر کے سامنے چٹان کی طرح کھڑے ہوجاتے ہیں جواس نظریۂ زندگی سے انکار کرتے ہیں اورانسانوں کی صلاحیتوں کو مضمحل کرنے کا باعث بنتے ہیں، اوراپنے ساتھیوں کے ساتھ بڑے نرم دل اوران کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے ہمہ وقت تیار۔ قوت اورمحبت کا ایک حسین امتزاج۔

جن بنیادوں پر یہ معاشرہ تشکیل پاتا ہے ان کے نزدیک قومیت کا معیار رنگ، نسل، زبان یا جغرافیائی حدود نہیں، بلکہ مشترکہ نظریۂ حیات ہوتا ہے۔ اس نظریۂ حیات پر یقین رکھنے والے ایک قوم کے افراد، اوراس کا انکار کرنے والے ایک دوسری قوم کے افراد۔ اس کے علاوہ یہ کسی تقسیم کے قائل نہیں ہوتے۔ اوراس تقسیم کی ضرورت بھی صرف اس لئے پیش آتی ہے کہ یہ ہرانسان کی آزادی کے قائل ہیں، جوکوئی برضا ورغبت اس معاشرے کا حصہ بننا چاہے، اس کا کھلے دل سے استقبال کرتے ہیں، اورجواس سے انکار کرے اس پر کوئی جبر نہیں۔

ان افرادِ معاشرہ کے نزدیک مقصدِ حیات اپنی اوردوسروں کی خودی کی تربیت اوراستحکام ہے۔ اورخودی کی تربیت کا ذریعہ اقبال کے نزدیک اطاعت اورضبطِ نفس کے ذریعے نیابتِ الٰہی کا حصول ہے۔ یہ نیابتِ الٰہی تسخیر کائنات کرکے اس کے ماحصل کو بنی نوعِ انسان کے لئے کھلا رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔

مستقل اقدارِ خداوندی کا اتباع کرنے والے افراد خوشی کے تلاش میں سرگرداں نہیں پھرتے۔ ان اقدار کے اتباع کا لازمی نتیجہ خوف اورحزن کی عدم موجودگی ہے۔ یعنی بیرونی خطرات سے حفاظت اوردل گرفتگی اورافسردگی سے نجات۔

اس معاشرے کے سیاسی نظام میں کوئی انسان، کسی بھی شکل میں، کسی دوسرے انسان کا محکوم نہیں ہوتا۔ یہاں حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (12:40)

الحکم صرف اسی خدا کے لئے ہے، اوراسی نے حکم دیا ہے کہ صرف اسی کے قوانین کا اتباع کیا جائے۔ یہی زندگی کا محکم اوراستوار نقشہ ہے۔ قوانین کا ایک خارجی منبع اورمعیار، جوعقلِ حیلہ جو کی ریشہ دوانیوں سے پاک ہے۔ اپنے سے برتر کے سامنے سجدہ ریز ہوکر اپنی ظاہر اورمخفی صلاحیتوں کی نمود۔ اسی ذاتِ اقدس کی صفات کا حدِّ بشریت کے اندر رہتے ہوئے اپنے

اندر پیدا کرنا۔

اسی خدا کی صفتِ رب العالمینی کا ظہور اس معاشرے کے معاشی نظام میں ہوتا ہے۔ جو فرد اس معاشرے کا حصہ بننا چاہتا ہے وہ خدا سے ایک بیع وشرع کا معاملہ کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَھُمۡ وَاَمۡوَالَھُمۡ بِاَنَّ لَھُمُ الۡجَنَّۃَ (9:111)

خدا مومنوں سے ان کی جان اور مال خرید لیتا ہے اور اس کے بدلے انہیں جنت کی ضمانت دیتا ہے۔ یہ جنت محض مرنے کے بعد کی جنت ہی نہیں بلکہ ہدایت خداوندی کے مطابق قائم شدہ معاشرے کی ارضی جنت ہے۔ کیونکہ مومن جب اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے تو اسلامی نظام اس کی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری اٹھالیتا ہے، بلکہ صرف اسی کی نہیں اس کی اولاد کی ضروریات کی ذمہ داری بھی اسلامی معاشرہ اٹھالیتا ہے۔

نَحۡنُ نَرۡزُقُھُمۡ وَاِیَّاکُمۡ (17:31)

لیکن اس اسلامی معاشرے کا قیام فرشتوں کے ہاتھوں نہیں ہوتا، اس نظام کے قیام کے لئے مومن اپنا مال ہمیشہ کھلا رکھتے ہیں اور اگر کبھی جان بھی دینی پڑے تو اس کے لئے تیار رہتے ہیں۔ یہی وہ بیع وشرع کا معاملہ ہے جو خدا مومن کے ساتھ کرتا ہے۔ یہی راہِ الفت کی وہ شہادت گاہ ہے جس کے متعلق اقبال نے کہا تھا۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

سوچئے کہ خدا کے لئے یہ قطعاً مشکل نہیں تھا کہ وہ بیع وشرع کے اس معاملے کے بعد مداخلت کر کے اس کے لیے ایک اسلامی معاشرے کا قیام کر دیتا۔ لیکن اسے انسان کی عزتِ نفس کا بھی خیال ہے، معاملہ طے پانے کے بعد یہ اس نظام کو اپنی محنت اور جدوجہد سے قائم کرے اور پھر اس کے مستقل قیام کے لئے روبہ عمل رہے۔ خدا سے صرف ہدایت ملتی ہے، اس ہدایت کے مطابق اس معاشرے کا قیام، جس میں یہ ربوبیتِ عامہ کی ذمہ داری کو پورا کرے، خود اس کے اپنے ہاتھوں ہوتا ہے۔ یعنی یہ اپنے لیے اس جنت کو خود تعمیر کرتا ہے، خیرات میں نہیں پاتا۔ خیرات میں ملی جنت تو اس ویسے بھی راس نہیں آئی تھی۔

یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ اسلامی نظام کا جس میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کی ذات کو حاصل ہے اور کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام نہیں۔ ایک ایسا معاشرہ جو مستقل اقدار کے بنیاد پر استوار ہوتا کہ ہر فردِ معاشرہ کے سامنے مقصدِ حیات واضح ہو۔ معاشرہ ہر فرد کی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری اٹھائے اور انہیں تسخیرِ کائنات کے لئے تمام ذرائع مہیا ہوں، اور اس کا ماحصل ہر انسان کے لئے یکساں کھلا رہے، اور کوئی اسے اپنے لئے سمیٹ کر نہ رکھ سکے۔

اب اس کے مقابلے میں عقلِ انسانی کے بنائے ہوئے نظاموں پر ایک نظر ڈالیے جہاں اقدار سے لیکر اخلاقیات

تک ہر شے اضافی حیثیت رکھتی ہے۔ معیشت حرص و ہوس پوری کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اور طاقتور کی غلامی کمزور کا مقدر۔ عقل کے تجرباتی طریق نے انسانی اختیار و ارادہ کے منفی پہلو کو تقویت دینے کے سوا کچھ اور نہ کیا۔ اور اگر ہم مزید اسی راستے پر چلتے جائیں گے تو اپنی بنائی ہوئی اس جہنم کا ایندھن ہم خود بنتے رہیں گے، اور ہماری انسانیت اس میں بھسم ہوتی رہے گی۔

ہر دو امیرِ کارواں، ہر دو بمنزلے رواں
عقل بہ حیلہ می رود، عشق برد کشاں کشاں

تحریکِ طلوعِ اسلام:

اب آخر میں شاید آپ احباب کے ذہن میں یہ سوال ابھرے کہ اس ضمن میں تحریکِ طلوعِ اسلام کا کیا کردار ہے۔ طلوعِ اسلام ایک فکری تحریک ہے، جس کا مقصد خدا کی کتاب میں دی گئی ہدایت کو خالص شکل میں عام انسانوں تک پہنچانا ہے۔ ہمارے نزدیک کسی بھی قوم کی تعمیر کے لئے فکر نہایت اہم ہے، ہنگامے تخریب کا کام کرتے ہیں۔ اسی لئے ہم عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتے کہ یہ ہنگامہ آرائی محض تخریب کا باعث بنی ہے۔ امت مسلمہ نے اگر اپنی کھوئی ہوئی شوکت کو دوبارہ سے حاصل کرنا ہے، تو پہلے اسے اپنے اندر ایک فکری انقلاب پیدا کرنا ہوگا، جو بجز قرآن ممکن نہیں۔ ہمیں قرآن کو طاقوں سے اٹھا کر اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا ہوگا، کہ یہی ذکر کے معنی ہیں۔ اور پھر اس میں دی گئی ہدایت کی بنیاد پر ایک جنتی معاشرے کے قیام کا آغاز کرنا ہوگا۔

ادارۂ طلوعِ اسلام کا انتظام ملک اور بیروں ملک قائم بزموں کے ذریعے چلتا ہے۔ یہ بزمیں اپنی بساط اور استطاعت کے مطابق ادارے کی سربراہی میں مختلف منصوبوں پر کام کرتی رہتی ہیں جن کے ذریعے قرآنی پیغام کی نشر و اشاعت کی جاسکے۔ تحریک کے بانی علامہ پرویز علیہ الرحمہ قرآنی رہنمائی پر مبنی اپنی کتب کا ایک ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔ اور ان کی زندگی میں ریکارڈ کیے گئے ہفتہ وار قرآنی درس ان بزموں میں چلائے جاتے ہیں۔ جدید دنیا کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ تمام کتب اور دروس انٹرنیٹ پر ڈیجیٹل شکل میں موجود ہیں۔

اس وقت بھی مختلف بزمیں کئی منصوبوں پر کام کر رہی ہیں۔ کتب کے مختلف زبانوں میں تراجم، دروس کے تراجم، اسوۂ حسنہ کی بنیاد پر طلباء کے لئے موبائل ایپ جس کے ذریعے انہیں ذات نبویؐ کی خصوصیات سے متعارف کرایا جائے تاکہ وہ ان خصوصیات کی بنیاد پر اپنی سیرت کو بہتر بنا سکیں۔

آپ میں سے جو احباب ہماری ان کوششوں میں ہمارا ساتھ دینے کے خواہش مند ہوں، وہ ادارے کے منتظمین سے رابطہ کر کے اپنے علاقے میں قائم بزم کا پتہ دریافت کر سکتے ہیں، اور ان بزموں کے رکن بن سکتے ہیں۔

ارشد علی ایڈووکیٹ، سوات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمانوں کے موجودہ مسائل اور اُن کا قرآنی حل

سلام اور رحمت!

اگر انسانی تاریخ پر غور کر کے دیکھا جائے۔ تو تقریباً 70 ہزار سال پہلے انسان ایک غیر اہم حیوان تھا۔ جو افریقہ کے ایک کونے میں اپنے سے کام رکھے ہوئے تھا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ انسانوں نے مل کر اپنے تقاضوں کے مطابق نظام وضع کئے جنہیں ثقافت کہا گیا۔ انہی انسانی تقاضوں کی بالیدگی سے تاریخ مرتب ہوئی۔ قریباً بارہ ہزار سال پہلے زرعی انقلاب اور پھر اس کے بعد محض پانچ سو سال قبل سائنسی انقلاب۔ مختصر یہ کہ انسان سارے سیارے کا حاکم بن گیا۔ اپنی غذائی پیداوار بڑھالی ہے۔ سلطنتیں قائم کیں۔ شہر تعمیر کئے ہیں۔ حتیٰ کہ تجارتی نظام کے لئے دور دراز تک سڑکیں تعمیر کیں۔

ترقی کی منازل طے کرتا ہوا آج آ کر اس مقام پر کھڑا ہے کہ موت کو بھی ٹکر دے سکے۔ ترقی پزیر ممالک میں شائد اس کا ادراک نہ ہو، کہ جنیاتی انجینئرنگ Genetic Engineering اور کمپوٹر کا الحاق کیا گل کھلا رہا ہے۔

ایک دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ 2050ء کے بعد ہم اس بات پر قادر ہو جائیں گے کہ چاہیں تو انسان صرف حادثاتی موت مر سکے۔ اور یہ صرف دعویٰ ہی نہیں ہے، بلکہ کیچوے کی عمر میں چھ گنا اضافہ کیا جا چکا ہے۔

نینوٹیکنالوجی (Nanotechnology) کی مدد سے ایسے خونی ذرات پیدا کئے جا رہے ہیں، جو جسم میں داخل ہو کر شریانوں کی رکاوٹ، جراثیم کا خاتمہ اور سرطان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ دل، گردے اور پھیپڑوں (Lungs) کے مشینی نعم البدل موجود ہیں۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ کیا ان ساری ایجادات نے دنیا میں تکالیف کم کرائیں؟ کیا ایسا نظام متعارف کرا لیا گیا، جس میں تمام انسانوں کے لئے روٹی کا انتظام ہو سکے۔ امن اور سلامتی کا کوئی پیغام موجود ہو۔ تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ اب آئیں مسلمانوں کی طرف جن کی حالت اس درجہ تباہ کن اور قابل رحم ہو گئی ہے۔ کہ جب بھی معاشرے کے چند افراد اکٹھے ہوتے ہیں، تو اپنی بربادی کا مرثیہ شروع کر دیتے ہیں۔ اس تباہی اور ذلت سے نکلنے کے لئے کسی کے پاس کوئی حل نہیں ہے۔ آج ہم جس کمزور اور پست مقام پر کھڑے ہیں، جب اس کی وجوہات پوچھی جاتیں ہیں تو ہمارا مذہبی طبقہ اس کا سبب یہ بتاتا ہے، کہ چونکہ مسلمانوں نے قرآن پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے اس لئے ہماری یہ حالت ہو گئی ہے۔ بظاہر دیکھا جائے تو جگہ جگہ مکاتب موجود ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں طلباء ان مکاتب سے فارغ ہوتے ہیں۔ تراویح، شبینے اور ختم القرآن کی محفلیں سب کچھ موجود ہیں، لیکن مسلمانوں کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی ہے۔ ہمارے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟

وہ اس لئے کہ ہم فکر کے دروازے بند کر رہے ہیں۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے، کہ جو لوگ ضد اور تعصب یا تقلید اور جہالت کی بناء پر عقل وفکر سے کام نہیں لیتے کچھ عرصہ کے بعد اُن میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ بہت بڑی حقیقت ہے، جس کی طرف قرآنِ کریم نے راہنمائی کی ہے۔

فطرت کے قانون کے مطابق جس عضو سے کام نہ لیا جائے کچھ عرصہ کے بعد فطرت اُسے بے کار سمجھ کر معدوم کر دیتی ہے۔ اور پھر وہ نوع اُس عضو سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم تاکید کرتا ہے کہ:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (45:13)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے۔ خدا نے ان سب کو تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو غور وفکر سے کام لیں (حقیقت تک پہنچنے کی) بہت بڑی نشانیاں ہیں۔ کائنات میں قوانینِ فطرت کارفرما ہیں۔ جو اٹل اور غیر متبدل ہیں۔ یہ قوانین انسانی فکر کے وضع کردہ نہیں خدا کے متعین کردہ ہیں۔ لیکن انسانی فکر انہیں دریافت کر سکتی ہے۔ اس کے بعد ان قوانین کی رُو سے فطرت کی مخفی قوتوں کو منکشف کیا جا سکتا، اور انہیں اپنے کام لایا جا سکتا ہے۔ انسانی فکر جوں جوں آگے بڑھتی جاتی ہے۔ تو فطرت کے تسخیر کردہ نت نئے گوشے (Discover) ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے انسان جب اپنی فکر کو مذہب کی بنیاد پر کسی ماضی کی منزل پر ساکن اور (Freez) کر دیتا ہے، تو اس کا علم آگے نہیں بڑھتا۔ ہمارے مسلمانوں کا مسئلہ یہ ہے، کہ ہم نے اپنی فکر کو ایک خاص حد تک منجمد کیا ہے۔ ہماری وجہ زوال یہ ہے کہ ہم نے اطاعتِ خداوندی اور اس کی پرستش میں کوئی امتیاز نہیں کیا۔ جو قوم اللہ اور رسول کی اطاعت ہی نہیں کرتی تو وہ اس کی اطاعت کے نتائج کس طرح حاصل کر سکتی ہے۔ ہمارا دین دار متقی اور پرہیز گار طبقہ مسجد میں جا کر چند رسومات کے ذریعے اللہ کی پرستش کرتا ہے۔ اور مسجد سے باہر نکل کر اطاعت انسان کے وضع کردہ نظام کی کرتا ہے۔ جس کی اطلاعت بہت بڑا جرم ہے۔ لیکن اگر یہ اطاعت اللہ کی کرنے لگیں تو اس کے لئے انہیں لازماً اسلامی نظام قائم کرنا ہوگا۔ ان تمام مصائب اور تنزلی سے نکلنے کا حل یہ ہے کہ انسانوں کے وضع کردہ نظام کو چھوڑ کر اپنا قرآنی نظام قائم کریں۔ قرآنِ کریم مسلمانوں کی زندگی کا محور و مرکز ہے۔ مسلمانوں کی زندگی کا مقصد ساری انسانیت کی نگرانی کرنا اور اُن کی خدمت کرنا ہے۔ قرآنِ کریم وہ ضابطۂ حیات دیتا ہے جس میں انسانیت کے مسائل اس طرح حل ہو جاتے ہیں کہ ہر شخص کو اُس کا صلہ مل جاتا ہے۔ یہ نظام ایسا معاشرہ تشکیل دیتا ہے۔ جس میں خوف اور حزن نام کی کوئی چیز نہیں رہتی۔ قرآنی نظام میں مکمل امن اور سلامتی ہوتی ہے۔ اور رزق کی فراوانی ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم کا وعدہ ہے کہ یہ نظام غالب آ کر رہے گا۔

قرآنی نظام ایمان اور اعمال صالحہ کے نتیجے میں قائم ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ کی مکی زندگی پوری کی پوری کردار سازی میں بسر ہوگئی۔ اور تیرہ سال کے عرصہ میں چند سو افراد حضور ﷺ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ بظاہر یہ پروگرام بڑا سست دکھائی دے رہا تھا۔ حضور ﷺ کی عمر رسالت صرف تیئس (23) سال تھی اور آپ ﷺ کا عہدِ رسالت قیامت تک کے عرصہ پر محیط تھا۔ اگر دیکھا جائے تیئس (23) سالہ گراں بہا عرصہ میں تیرہ سال کی مدت ابتدائی جماعت

سازی میں صَرف ہوگئی اور ماحاصل چند سوافراد سے آگے نہ بڑھا۔لیکن حضور ﷺ کی طرف یہ کچھ نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ ہوا۔ یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ لوٹ مار، جنگ وجدل فتنہ وفساد عربوں کی گھٹی میں پڑا تھا۔اور اس جماعتِ نو کے افراد پر ہر قسم کے مظالم ہوئے اُنہیں نا قابل برداشت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔لیکن اُن میں سے نہ کسی نے کسی قسم کا دنگا فساد، نہ لڑائی جھگڑا نہ کسی کو لوٹا اور نہ کسی کے اوپر پتھراؤ کیا۔حتیٰ کہ اُنہیں نہ کبھی جھوٹ بولنا پڑا اور نہ کسی کو فریب دیا۔اور جب دیکھا کہ مکہ کے مقابلہ میں مدینہ کی فضاء اس نظام کے لئے زیادہ موزوں ہے تو نہایت خاموشی سے ہجرت کر کے وہاں چلے گئے اور جاتے وقت بھی کسی کو کسی قسم کا دھوکا دیا اور نہ ہی خیانت کی۔

جب مدینہ گئے تو وہاں کسی سے حکومت نہیں چھینی اور نہ ایسا ہوا کہ کوئی بنی بنائی حکومت کسی نے اُن کے حوالے کر دی ہو۔ وہاں جا کر اُنہوں نے اپنی مملکت قائم کی۔اور جب یہ جماعت صاحبِ اقتدار ہوگئی یعنی وسائل رزق ان کے قبضہ میں آ گئے تو معاشرہ میں نظامِ ربوبیت خود بخود نافذ ہوگیا۔اور یہ کاروان جو مکہ سے روانہ ہوا تھا مختلف وادیوں سے گزرنے کے بعد اپنی منزل مقصور تک جا پہنچا۔منزل پر پہنچنے کے بعد کسی کے دل میں یہ سوال نہ اُبھرا کہ یہ ہماری منزل مقصور ہے۔یا نہیں۔اُن میں سے ہر فرد کو یہ معلوم تھا کہ اس سوسائٹی کا مقصود ومنتہیٰ کیا ہے۔یعنی اسلامی نظام قائم ہوگیا۔اس کے بعد یہ لوگ اس نظام کے استحکام وفروغ اور اندرونی اور بیرونی خطرات سے اس کی حفاظت کے لئے مصروف جدوجہد رہے۔یہ تو تھا طریق جس کے مطابق صدرِ اوّل میں یہ نظام قائم ہوا۔اب آیئے! پاکستان کی طرف یہ مملکت خداداد تو ہمیں مل گئی، یعنی استخلاف فی الارض لیکن بدقسمتی سے وہ نظام قائم نہیں ہوا جو مقصود تھا۔جماعتِ مومنین کو جو مملکت ملی تھی وہ اُن کے اعمال کی وجہ سے تھی، یعنی قرآن میں ہے کہ:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (24:55)

یعنی یہ مملکت نہ کسی سے چھین جھپٹ کر لی گئی تھی نہ کسی نے بطورِ بخشش ہبہ کر دی تھی۔یہ اُن کے اعمال صالحہ کا فطری نتیجہ تھی۔

اب اگر پاکستان کا تذکرہ کیا جائے تو یہاں بہت بڑی اکثریت مسلمانوں کی ہیں۔کہنے کو تو سب مسلمان ہیں لیکن اِن میں سے کسی نے اسلام کو سوچ سمجھ اور دل ودماغ کے اطمینان کے ساتھ بطیب خاطر قبول نہیں کیا۔نہ ہی اِن کے سامنے اسلام کا کوئی واضح اور متعین مفہوم ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ پرویز صاحب نے مسلمانوں کو بتایا کہ ہمارا مروجہ اسلام دین نہیں رہا مذہب میں تبدیل ہو چکا ہے۔اسے جب تک دین میں تبدیل نہیں کیا جائے گا۔مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوں گے۔اُن کے لکھے ہوئے ہزاروں صفحات پر مبنی کتابیں اور کئی سو گھنٹوں پر مشتمل دیئے گئے دروس کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ سب سے پہلے مذہب اور دین میں فرق واضح کریں۔پس اُنہوں نے اپنی بصیرت کے مطابق اس کے متعلق اپنے تصورات کو عام کیا اور ہمیں بتایا کہ اگر آپ لوگ ان تصورات سے متفق ہیں۔تو آپ بھی اس طرح انہیں عام کرتے جائیں تا کہ ہماری قوم کے سامنے دین کے صحیح تصورات آ جائیں۔

آخر میں اپنی تجویز پیش کرتا ہوں کہ پرویز صاحب کی اس فکر کو عام کرتے جاؤ، اور اتنا پھیلاؤ اس فکر کو کہ یہ ہر ایک کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جائیں اور اس کے نتیجے میں قرآنی نظام قائم ہو جائے۔قرآنی نظام کے ذریعے مملکت کے ہر شہر کی صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہوتی جائے، اور اس طرح اُن کی ذات کی بھی نشوونما ہوتی جائے۔

خورشید انور، سوات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام کا خطاب

(ہفتہ 26 اکتوبر 2024ء)

قابل صد احترام نمائندگان وارا کین بزمہائے طلوع اسلام، السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ کوئی بھی مقصد چاہے جتنا بھی عظیم ہو اس کے حصول کیلئے اگر درست راستہ اختیار نہ کیا جائے تو ہر اٹھنے والا قدم منزل سے دوری کا سبب بنتا ہے اور نتیجتاً "حصول مقصد ناممکن نظر آنے لگتا ہے جس کی وجہ سے اکثر یقین کی بنیادیں بھی متزلزل ہونے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے۔ علامہ پرویز علیہ رحمہ نے قرآن حکیم کے تعلیمات کو حقیقی راہ عمل بنانے کیلئے راستے کا تعین طلوع اسلام کے دستور اساسی کے شکل میں کر دیا تھا۔ جس کے تحت تحریک میں شامل ہونے والوں کو کچھ ضروری قواعد وضوابط پر سختی سے کاربند رہنے کا پابند بنایا گیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد آہستہ آہستہ دستور اساسی کے قواعد و ضوابط محض تحریر تک محدود ہوگئیں اور اب تو انہیں مکمل طور پر نظر انداز کیا جا چکا ہے۔ حالانکہ قرآنی فکر سے وابستہ احباب کو سب سے زیادہ ڈسپلن کا پابند ہونا چاہئے، اور جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ پابندیاں کہیں باہر سے لاگو کردہ جبری پابندیاں نہیں ہوتیں بلکہ مومن کے دل کی آواز ہوتی ہیں، جن کو وہ دل کے گہرائی سے خود اپنے اوپر لاگو کرتا ہے اور ان پر پابند رہنے کا عہد کرتا ہے۔ ہماری بے عملی اور دستور اساسی کے راستے سے بھٹکنے کی وجہ سے بزموں کی تعداد آدھی سے بھی کم رہ گئی ہے اور جو بزمیں موجود ہیں ان میں بھی کافی تعداد میں بزمیں عملی طور پر غیر فعال ہیں۔

لہٰذا میں آپ سب کی توجہ دستور اساسی میں درج چند اہم نکات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اور امید رکھتا ہوں کہ اپ تمام احباب اس بات کو یقینی بنائینگے کہ اس دستور اساسی کے ایک ایک لفظ کو بغور پڑھ کر نہ صرف ذہن نشین بلکہ قلب نشین کر کے اس کو ہر قدم پر ذہن سے اوجھل نہ ہونے دینگے۔ آئیں ملکر طلوع اسلام کے دستور اساسی کے ان اہم نکات کو بغور پڑھتے ہیں:

1۔ مقصد

بزم طلوع اسلام نہ کوئی سیاسی پارٹی ہے نہ مذہبی فرقہ۔ یہ ایک اجتماعی کوشش کا ذریعہ ہے اس قرآنی فکر کی نشر واشاعت کے لیے جسے ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ اسلام میں جو غیر قرآنی تصورات شامل ہو گئے ہیں انہیں الگ کر کے پھر سے اس نظام کی تشکیل کے لیے فضا سازگار بنائی جائے جو عہد محمد رسول اللہ صہ والذین معہ میں قائم ہوا تھا اور جسے خلافت علی منہاج نبوت کہا جاتا ہے۔ اس فکر کی نشر واشاعت کے لیے نہایت پرامن طریق اختیار کیا جائے

گا۔ مثلاً ماہنامہ طلوع اسلام، پمفلٹس، طلوع اسلام ٹرسٹ کی طرف سے شائع ہونے والی کتابیں، پرویز علیہ رحمہ کا درس قرآن کریم اور ان کے خطابات جو مختلف تقاریب پر پیش کیے جائیں۔ سنجیدہ انداز میں گفتگوئیں، جس میں بحث وجدل کا انداز نہ ہو۔

رکن اور اس کے فرائض

(الف) ہر وہ مسلمان جو ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر اور دستور اساسی اور اصولی ہدایات سے متفق ہو اور ان ہدایات کو، جو ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے وقتاً فوقتاً جاری ہوں، تسلیم کرنے کا عہد کرے، وہ نمائندہ بزم کی منظوری سے بزم کا ممبر بن سکتا ہے۔ اس مقصد کیلئے اسے فارم رکنیت پر کرنا ہوگا۔ رکن بنانے سے پہلے نمائندہ کو اس امر کا اطمینان کر لینا چاہئے کہ درخواست کنندگان طلوع اسلام کی پیش کردہ قرآنی فکر کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اس سے متفق ہیں۔ ان کا انداز تعمیری ہے، تخریبی نہیں اور وہ دیگر اراکین بزم کے ساتھ دلی رفاقت اور نظم وضبط کی پابندی کا جذبہ رکھتے ہیں۔

(ب) طلوع اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اسلامی ارکان (نماز، روزہ وغیرہ) کی ادائیگی کے جو طریقے امت میں رائج چلے آرہے ہیں، ان میں کسی قسم کی تبدیلی، یا کسی نئے طریقے کی ترویج کا حق کسی فرد یا فرقہ کو حاصل نہیں۔ اس لئے اراکین بزم ان اسلامی ارکان کو اپنے اپنے طریق پر ادا کرنے کے مجاز ہونگے۔ بزم سے وابستگی ان کے اس مسلک میں حائل نہیں ہوگی۔

(د) کوئی رکن کسی سیاسی پارٹی کا ممبر نہیں بن سکتا۔ البتہ وہ ملک کے مختلف انتخابی اداروں (مثلاً پارلیمان وغیرہ) کا آزاد ممبر بن سکتا ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ ان اداروں میں اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش آئے جو قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہو، تو وہ اس کی تائید نہیں کریگا۔

(س) کوئی رکن ایسی بات نہیں کریگا جس میں فرقہ بندی، پارٹی بازی یا تفرقہ انگریزی کا شائبہ تک بھی پایا جائے۔ جس سے تحریک طلوع اسلام کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہو، یا وہ اس تحریک کے لئے نقصان یا تخریب کا موجب ہو یا پاکستان کی آئیڈیالوجی اور اس مملکت کے استحکام کے خلاف ہو۔ (ش) ہر رکن کے لئے ضروری ہے کہ وہ رسالہ طلوع اسلام اور طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور کی طرف سے شائع ہونے والی کتابوں کا بغور مطالعہ کرے۔ اس کا عملی طریق، ہر بزم اپنے اپنے حالات کے مطابق تجویز اور اختیار کرے گی۔

اجلاس:

بزم کا اجلاس حسب ہدایت نمائندہ منعقد ہوا کرینگے۔ لیکن مہینہ میں کم از کم ایک اجلاس کا منعقد ہونا ضروری ہے۔ بزم کے میٹنگ میں صرف تحریک سے متعلق امور پر بحث وتمحیص ہوگی، کسی اور مسئلہ یا معاملہ کو موضوع گفتگو نہیں بنایا جائے گا۔ نہ ہی نظری بحثوں میں وقت ضائع کیا جائے گا۔ قرآنی نکات کی افہام وتفہیم بھی الگ نشستوں میں ہوگی۔ میٹنگ اور دیگر اجتماعات میں ڈسپلن کا ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہوگا۔

بزم کے لئے پابندی

(الف) بزم تمام معاملات میں ادارہ کی ہدایات اور فیصلوں کی پابند ہوگی۔لیکن جو اقدامات وہ ازخود کرے گی اس کی ذمہ دار خود ہوگی۔ادارہ اس سے ان کے متعلق باز پرس کر سکے گا۔

(ب) ہر بزم کے لئے لازمی ہوگا کہ وہ ادارہ کی تمام مطبوعات اور رسالہ طلوع اسلام کا فائل اپنی لائبریری میں رکھے اور حتی الامکان اس امر کی کوشش کریں کہ مفکر قرآن کے درس کا بذریعہ آڈیو/ ویڈیو انتظام کریں۔

فرائض نمائندہ

(الف) نمائندہ کا فریضہ ہوگا کہ وہ ارکین بزم کا مکمل فہرست ادارہ کو بھیجے اور اس میں وقتاً "فوقتاً" جو تبدیلیاں ہوں، ان سے ادارہ کو اطلاع دیتا رہے۔

(ج) بزم کی آمد و خرچ کا گوشوارہ ہر ماہ بزم کی میٹنگ میں پیش کریں۔د: بزم کی میٹنگز کی روئیداد رجسٹر میں درج کریں اور ماہانہ رپورٹ ادارہ کو بھیجیں۔

(س) ادارہ کی طرف سے موصول شدہ ہدایات کو اراکین کے علم میں لائے اور ان پر ضروری عمل درآمد کرے۔

عزیزان محترم میں عرض کردوں کہ یہ صدی فکر پرویز کی صدی ہے۔اس لئے مختلف افراد اور گروہ ان کا کام اور نام مسلسل کیش کرانے میں مصروف ہیں۔کیونکہ ہم نے ان کے لئے خلا چھوڑی ہوئی ہیں۔دوسری طرف ہر دل حساس، دنیا میں جاری ظلم و بربریت، بھوک و افلاس، بے انصافی اور بدامنی کے وجہ سے خون کی آنسو رو رہا ہے اور چاہتا ہے کہ کاش، اس ظالمانہ ابلیسی نظام کی جگہ کوئی انسانیت ساز فلاحی نظام کا قیام عمل میں آجائے۔اور اپ یہ بھی جانتے ہیں کہ فلاح انسانیت کا وہ آفاقی نظام، دین اسلام ہے، جس کا منشور قرآن حکیم ہے۔اور یہ بھی کہ علامہ پرویز علیہ رحمہ نے وہ انسانیت ساز نظام، قرآن کریم سے اخذ کر کے، تحریری طور پر ہماری زبان میں مرتب کر کے رکھ چھوڑا ہے، جو تحریک طلوع اسلام کے ہاں محفوظ چلا آرہا ہے۔اس لئے ہمارا فریضہ بنتا ہے کہ ہم دن رات ایک کر کے قرآن کریم کا زندگی بخش پیغام، تحریک طلوع اسلام کے پلیٹ فارم سے عام کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔قرآن کریم مومنین کی تعارف کچھ اسطرح کراتا ہے،۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۱۵ (سورۃ الحجرات, آیت 15)

مفہوم: مومن انہیں کہتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر (علیٰ وجہ البصیرت) ایمان لائیں۔اس طرح کا ایمان کہ اس کے بعد، ان کے دل میں ذرا سا بھی اضطراب اور شک باقی نہ رہے۔اور وہ پھر، اس نظام کے قیام اور استحکام کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں، اور اس کے لئے اپنا مال بھی خرچ کریں، اور ضرورت پڑے تو جان تک بھی دیدیں۔یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دعوے ایمان میں سچے ہیں۔

لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ فرمانِ الٰہی کے مطابق صرف نظام اور نظام چلانے والوں کو چیڑا جائے نہ کہ مذہب یا مذہب پرستوں کو۔ کیونکہ اسلام دین ہے، ایک نظام زندگی ہے، اور ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم رائج الوقت نظام کی جگہ اسلامی نظام کو رائج کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں۔ اس لئے ہم نے حکمرانوں کو مخاطب کرنا ہے، جیسا کہ سورہ طٰہٰ، آیت 43) میں حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا۔

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾ (سورہ طٰہٰ، آیت 43)

تم دونوں فرعون کی طرف جاؤ۔ وہ اپنے ظلم وستم میں حد سے زیادہ آگے بڑھ گیا ہے۔ اس کی سرکشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔

جہاں تک مذہب پرستوں سے تخاطب کا تعلق ہے، اس کے متعلق ارشاد ربانی ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ (سورۃ آلِ عمران، آیت 64)

مفہوم: تم اِن مذہب پرستوں سے کہو کہ ان جزئی باتوں کو چھوڑ دو، اور اس اصل الاصول کی طرف آؤ جس کے ماننے کے تم بھی دعویدار ہو، اور جس کی طرف ہم بھی دعوت دیتے ہیں۔ یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور (کے قوانین) کی محکومی اختیار نہ کی جائے۔ اُس کے اِس اقتدار واختیار میں، کائنات کی کسی شے کو شریک نہ کیا جائے۔ نہ ہی، اُس کے سوا، ہم ایک دوسرے میں سے کسی (انسان) کو، خدائی اختیارات کا حامل سمجھیں۔

اگر یہ لوگ توحید کے اس مرکزی نقطہ پر جمع ہو جائیں تو ہو المراد۔ اور اگر اس سے رُوگردانی کرنا چاہیں، تو اِن سے کہہ دو کہ تم جس طرف بھی جانا چاہتے ہو، جاؤ۔ ہم صرف ایک اللہ کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں۔ جسے تم خود دیکھ رہے ہیں۔

عزیزان محترم مگر ظاہر ہے کہ جب تک ہم دل کی کامل رضامندی اور یکسوئی سے قرآنی ہدایات اور تحریک کے وضع کردہ طریقہ کار پر کاربند نہیں رہیں گے، آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔ اسکے ساتھ ہی جب تک اپنے رب اور اپنے آپ پر یہ اعتماد نہ ہو، کہ یہاں پر قرآنی انقلاب ہم ہی نے لانا ہے کسی اور نے نہیں، اور تحریک طلوع اسلام کے پلیٹ فارم ہی سے لانا ہے کسی اور پلیٹ فارم سے نہیں۔

تب تک ہماری کاوشیں بار اور نہیں ہو سکتی۔ مگر بدقسمتی سے حقیقت اسکے برعکس ہے۔ ہم میں سے ہر ایک دوسرے پارٹیوں سے یا شخصیات سے توقعات وابستہ رکھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اس کی حقیقت سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ کیونکہ اس قرآنی تحریک سے زیادہ پاور فل تحریک کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ جہاں تک قائدانہ صلاحیتوں کا تعلق ہے تو ماشاء اللہ آپ سب میں دوسروں سے زیادہ قائدانہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ صرف استعمال کا دیر ہے، ورنہ منزل زیادہ دور نہیں۔

آج کل دور ہی سوشل میڈیا کا ہے اور سب سے سستا اور سب سے موثر ترین ذریعہ بھی یہی ہے۔ لہٰذا اگر ہر ممبر اپنی پیج سے صرف ادارے کے پیج سے شیئر کردہ مواد ہی شیئر کرتا رہے تو انشاء اللہ بہترین نتائج نکلیں گے۔ کیونکہ جب تک حق بے نقاب ہو کر سامنے نہیں آئے گا باطل نہیں مٹ سکتا۔ لہٰذا ہر ممکن کوشش کیجئے اللہ تعالیٰ آپ کی ارادوں میں برکت اور آپ کے بازوں میں زیادہ ہمت عطاء فرمائے۔ واسلام

خالد بشیر فاروقی، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالۡعَصۡرِ

صاحبِ صدر، سٹیج پر تشریف فرما معززین سینئرز، جونیئرز السلام علیکم!

مائیک پر آتے ہی آپ سب کی طرح میں بھی بسم اللہ پڑھتا ہوں یہ پڑھتے وقت ہر حالت میں مجھے اپنے شفیق دوست محبت اور شرافت کا پیکر یاد آتے ہیں ان کی شخصیت کچھ اس طرح تھی:

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز

وہ تھے جناب فرید الدین صاحب کم از کم مجھے بسم اللہ کا مفہوم انہوں نے ہی سمجھایا ہے۔ جو کچھ اس طرح ہے۔ عام فہم ترجمہ جو علماء حضرات نے کیا ہے کچھ یوں ہے: ''میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے'' کیا اس میں پرستش کا پہلو نمایاں نہیں ہوتا؟

پہلا لفظ ''ب'' سے مراد شروع کرنا نہیں ہے مُراد ساتھ ہے اگلا لفظ ہے اسم جس کی تشریح اللہ کی صفات ہیں۔ اس کے بعد اللہ رحمٰن اور رحیم۔ اس طرح بسم اللہ کا مفہوم یہ ہوا کہ میں جو بھی کام کروں اللہ کی صفات رحمٰن و رحیم کو سمجھوں گا پرکھوں گا اور اُس رنگ میں رنگا جاؤں گا۔ اب میں خراجِ تحسین پیش کرنا چاہوں گا اپنے اساتذہ کو جن میں پہلا نام میرے والد محترم جناب بشیر احمد قریشی جن کی صحبت کی وجہ سے میں آج ادارے سے جڑا ہوا ہوں۔ اساتذہ میں اگلا نام محترم شیخ اللہ دتہ، ڈاکٹر انعام الحق، خورشید انور، سلیم اختر، محمد عمر صاحب، ڈاکٹر صدیق اکبر صاحب۔ مگر سب سے اہم شخصیت جن کے احترام میں جتنا جھکوں کم ہے کمر ابھی جازت نہیں دیتی۔ اُن کی دی ہوئی تعلیم اور قرآنی مفہوم کی کیا اہمیت ہے، آپ پہلے ذہن میں دو ہستیوں کو لے کر آئیں۔ ایک ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جنہوں نے وحدانیت کے راستے میں آنے والے تمام بت پاش پاش کر دیئے۔ اس اُمت کو ملتِ ابراہیمی کہا گیا۔ دوسری ہستی مبارک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اُسی سنت ابراہیمی پہ عمل کرتے ہوئے حق کی تلقین کی اور باطل کی نفی کی۔ اب آجائیں 14 ویں صدی میں، اس صدی میں ایک ایسی شخصیت جن کی پہچان ہے کہ انہوں نے مذہبی پیشوائیت کا بت توڑا اور اللہ کا دین سمجھایا۔ وہ عظیم شخصیت علامہ غلام احمد پرویز ہیں۔۔۔ انہوں نے دین اور مذہب کے فرق کو اقبال کے الفاظ میں کیسے واضح کیا۔

دین کیا ہے: یا وُسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل

اور مذہب کیا ہے: یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات

پرویز صاحب کے بارے میں ہی میں کہوں گا:

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد چشمِ خود بربست و چشمِ ما کشاد

ترجمہ: اکثر شاعر مرنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں انہوں نے اپنی تو آنکھیں بند کر لیں اور ہماری آنکھیں کھول دیں۔

اب آیئے پرویز صاحب کو خراجِ تحسین کیسے پیش کیا جا رہا ہے۔۔ بات اساتذہ کی ہو رہی ہے۔۔۔ قرآن سے حوالہ ہے ''اَلَا بِذِكۡرِ اللّٰهِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ ﴿۲۸﴾ (13:28) مُلا حضرات نے ترجمہ کیا کہ اللہ اللہ کرتے رہو۔ میرے نزدیک ذکر کا

معنی مثال کے طور پر 6 ستمبر 1965 کو نشانِ حیدر لینے والے عزیز بھٹی کے سکولوں میں تذکرے کے جیسا ہے۔ تذکرہ یعنی ذکر۔ تو کیا ہم بار بار عزیز بھٹی، عزیز بھٹی کرتے رہیں؟۔۔۔نہیں بلکہ ان کی شجاعت کا تذکرہ ہونا چاہئے۔ ذکر کا معنی ہوا (نمایاں کرنا) اور برتر نفس کی مقصدیت کو قبول کرنا۔۔۔اس طرح آج کے حالات میں پرویز صاحب کا ذکر یا تحریک طلوعِ اسلام کو متحرک رکھنے کے لئے ایک ایسے استاد کا ذکر کروں گا۔ جنہوں نے پرویز صاحب کی کئی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور کر رہے ہیں اور ہر اتوار طلوعِ اسلام سیمینار کے نام سے زوم پر UK سے پروگرام پیش کر رہے ہیں۔ وہ ہیں جن کا بھرپور تالیوں میں نام آتا ہے ڈاکٹر اعجاز رسول صاحب۔ میرا آج کا خطاب یا خطبہ چند الفاظ یا چند کلمات پر مبنی ہے مسجد کا امام وعظ کرتا ہوتا ہے کیا کبھی اس سے تبدیلی آتی ہے کلمات کا واحد ہے کلمہ۔ کلمہ کے معنی ہوئے ''جو مخاطب کا نقطۂ نظر تبدیل کر دے''

میرے خطاب کا اگلا اور آخری حصہ وقت کی اہمیت ہے۔ قرآن سے حوالہ ہے سورۃ العصر کی صرف ایک آیت۔ وَالْعَصْرِ ① ملا حضرات نے اس کا ترجمہ کیا ہے قسم ہے زمانے کی۔ خالق اپنی کائنات کے کسی بھی جز (Component) کی قسم نہیں کھاتا اس کا مفہوم کیا ہے اسے یوں کہا جائے زمانہ یعنی انسانیت کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے خدا تعالیٰ الْعَصْرِ کو شہادت میں لے کے بات کرتا ہے۔ الْعَصْرِ میں حال مستقبل اور گزرا ہوا وقت بھی آجاتا ہے جیسے قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط کے عروج و زوال۔۔۔الْعَصْرِ یعنی وقت کی اہمیت کیا ہے؟

دنیا کی ہر شئے رک سکتی ہے اگر نہیں تو گھڑی کی ٹک ٹک نہیں رک سکتی یا آنے والا وقت نہیں رکتا۔

الْعَصْرِ مثال کے طور پر میں اپنے دوست سے کہتا ہوں میرے قیمتی نوٹس واپس کر دو۔ تو وہ کہتا ہے عصر کے بعد لوٹا دوں گا، یہاں دل دھک سے رہ جاتا ہے دن تو ڈھل گیا اسے براڈ رویو میں لیجئے، اللہ بندے سے مخاطب ہے۔۔۔اے بندے جس مقصد کے لئے تجھے پیدا کیا گیا ہے یعنی کائنات کے پراجیکٹ کو آگے بڑھانے کا، اُس مقصد کو پورا کرنے کا وقت جا رہا ہے لہٰذا اپنا پورٹ فولیو مکمل کر لے۔ جو تیرے ساتھ جائے گا وقت کی اہمیت میں چھوٹی چھوٹی باتوں کی بھی اہمیت ہے۔ جیسے آج کا کام کل پہ مت چھوڑو۔ میاں محمد بخش فرماتے ہیں۔ پنجابی شعر ہے

لوئے لوئے بھر لے کُڑیے جے تدھ بھانڈا بھرنا

اٹھ فریدا ستیا، تیری داڑھی آیا بُور تیرا اگا آیا نیڑے پچھا رہ گیا دور

(سوئے ہوئے فرید اُٹھو۔۔ تیری داڑھی سفید ہوگئی، بڑھاپے نے آلیا ہے۔ اب بھی خواب سے نہیں جاگو گے، اس وقت بھی اپنی دنیا و آخرت سنوارنے کی نہیں سوچو گے۔ اب فارسی میں ہیں ؎

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

''میں چلتے چلتے پاؤں سے کانٹا نکالنے کے لئے رک گیا، اتنے میں قافلہ نظروں سے اُوجھل ہوگیا۔ میں ایک لمحے کو غافل ہوا اور میرا راستہ سو سال دور ہوگیا۔

میرے خطاب کا خلاصہ یہ ہوا کہ الْعَصْرِ ''تاریخ کا نچوڑ'' یہ کہ انسان نے جب بھی معاشرتی نظام فطری ہدایت یعنی قوانین وحی کی روشنی کے بغیر مرتب کیا وہ خسارے میں رہا۔ اب بھی وقت ہے کہ انسانیت کو خسارے سے بچا لیا جائے۔

آواز دے کے دیکھ لیں شاید وہ مل ہی جائے ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے

☆''جب ہمارے پاس قرآن کریم ایسی مشعلِ ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکتے؟''۔ (پیغام عید 13 نومبر 1945ء)(طلوع اسلام ستمبر 1972ء صفحہ:30)

☆☆☆☆☆☆☆

☆''اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ حیات ہے۔ یہ ضابطۂ حیات مذہب، معاشرت، تجارت، عدل، فوج، سول، فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی واجبات کا سوال ہو یا انفرادی حقوق کا، اخلاقیات کا معاملہ ہو یا جرائم کا، اس دنیا میں مجرموں کی سزا کا سوال ہو یا آخرت کی عقوبت کا، ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں، اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہئے''۔ (عید کا پیغام 1945ء)(طلوع اسلام جنوری 1960ء صفحہ:73)

☆☆☆☆☆☆☆

☆''اس وقت میدان سیاست میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی جنگ ہو رہی ہے لوگ پوچھتے ہیں کہ کون فتح یاب ہوگا، علم غیب تو خدا کو ہے، لیکن میں ایک مسلمان کی حیثیت سے علیٰ روس الاشہاد کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم قرآن مجید کو اپنا آخری اور قطعی رہبر بنا کر ثبات و استقامت پر کاربند رہیں اور اس ارشاد خداوندی کو کبھی فراموش نہ کریں کہ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں تو ہمیں دنیا کی کوئی طاقت یا کئی طاقتوں کا مجموعہ بھی مغلوب نہیں کر سکتا''۔ (جلسۂ عام حیدر آباد دکن 11 جولائی 1946ء)(طلوع اسلام فروری 1966ء صفحہ:39)

☆☆☆☆☆☆☆

☆''ہم (ہندوؤں کی طرف سے) ایک ایسی سازش کا شکار ہوئے ہیں جو بڑی گہری اور سوچ سمجھ کر اختیار کی گئی تھی اور جسے دیانت، شجاعت اور عزت کے ابتدائی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر بروئے کار لایا گیا ہے، ہم بحضور رب العزت سجدہ ریز ہیں کہ اس نے ہمیں ایسی ہمت اور یقینِ محکم عطا فرمایا، جس سے ہم نے شر کی ان تمام قوتوں کا پورا پورا مقابلہ کیا۔ اگر ہم نے قرآن کریم سے راہنمائی حاصل کی تو میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ آخر الامر کامیابی ہماری ہی ہوگی، میرا آپ سب سے اور ان تمام افراد سے جن تک میرا یہ پیغام پہنچے، مطالبہ یہ ہے کہ آپ پاکستان کو اسلام کا محکم قلعہ بنانے اور اپنے آپ کو ایک ایسی عظیم ملت کی شکل میں تعمیر کرنے کے لئے جس کا مقصد ملک کے اندر اور باہر امن قائم کرنا ہو، عند الضرورت سب کچھ قربان کر دینے کا عہد کریں''۔ (یونیورسٹی اسٹیڈیم لاہور 3 اکتوبر 1947ء)(طلوع اسلام جنوری 1961ء صفحہ:42)

☆☆☆☆☆☆☆

☆''اگر ہم قرآن مقدس سے تحریک اور ہدایت حاصل کریں تو میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ آخری فتح ہماری ہوگی''۔

(طلوع اسلام فروری 1959ء صفحہ:69)

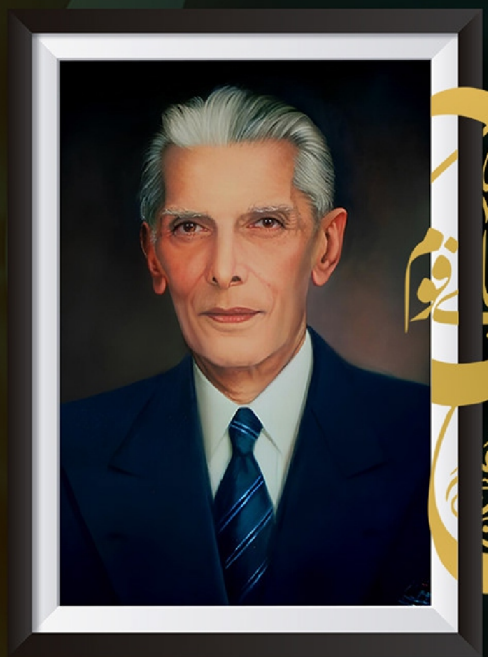
PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.77
ISSUE
12

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/idaratolueislam1/ www.youtube.com/idaratolueislam



محمد علی جناح بابائے قوم